

# خلوص عشق

مدیریت

”ان میں سے کون سا ڈریس پہن کے جاؤں؟“ صوما ڈھیر سارے ڈریسر سامنے پھیلائے ان سے مشورہ مانگ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے یہ مچنڈا کمر ڈریس ٹھیک رہے گا۔“ ماہا نے شوخ کمر کے ڈریس پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”وہ ڈے فنکشن میں جارہی ہے نہ کہ ٹائٹ فنکشن میں، اس لحاظ سے یہ پنک کمر کا سوٹ ٹھیک رہے گا۔“ شائل کے مشورے پہ صوما نے اثبات میں سر ہلایا۔ گویا اسے یہ مشورہ پسند آیا تھا۔

”تم لوگ ابھی یہیں ہو؟“ مسفرہ جو ابھی یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ کمرے میں قدم رکھا تو سامنے پھیلے ہوئے ڈھیر سارے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”بس ہم جانے ہی والی تھیں۔“ صوما نے

پنک کمر کا ڈریس اٹھاتے ہوئے کہا۔

آج صوما اور ماہا کی مشترکہ دوست کی سالگرہ تھی ان دونوں نے کل رات سے ہی جانے کا شور ڈالا ہوا تھا۔ مسفرہ کے تو کان پک گئے تھے۔ اس کا خیال تھا اس کے یونیورسٹی سے لوٹنے سے پہلے وہ دونوں جا چکی ہوں گی۔ لیکن انہیں گھر میں ہی دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھی۔

”جب تم دونوں پہنچو گی تو لوگ اپنے اپنے گھروں میں پہنچ چکی ہوں گی۔“ ان کی تیاری ختم ہونے میں نہ آ رہی تھی۔ شائل سے رہا نہ گیا تو بالآخر بول ہی اٹھی۔

”شکل اچھی نہ ہو تو بندہ بات تو اچھی کر سکتا ہے۔“ ماہا کو خاصی تکلیف ہوئی تھی جس کا اظہار کرنا اس نے ضروری سمجھا تھا۔

”تم لوگوں نے نمائش میں جانا ہے جو ابھی تک تیاری مکمل نہیں ہو رہی۔ لڑکا بیچارہ گاڑی

مکمل ناول





میں بیٹھا سوکھ رہا ہے۔“ زرینہ بیگم کی پاٹ دار آواز نے ان دونوں کے حواس معطل کر دیئے۔  
”بس تائی امی! ہم نکل رہی ہیں۔“ ماہی نے آخری بار خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ ان کا غصہ مزید اوپر جاتا۔ وہ دونوں جلدی سے انہیں سلام کرتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

”مسفر! تم نے یونیورسٹی سے آکر کھانا کھایا؟“ وہ اب اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔  
”جی ماما جان! میں بس کھانے ہی لگی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے لوٹی تھی۔“ اس نے جلدی سے جواب دینے کے ساتھ عذر بھی پیش کیا مبادا اس کی شامت نہ آجائے۔ حالانکہ باقیوں کے برعکس وہ اس سے نہایت نرمی سے پیش آتی تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے ابھی یہاں آئے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا اور ”نی الحال“ وہ اس سے نرمی برت رہی تھیں۔ یا کوئی اور وجہ تھی۔ وہ جاننے سے قاصر تھی۔ البتہ ان کا غصیلا رویہ بھی اسے برا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ عام طور پر وہ کسی وجہ ہی سے غصے میں آتی تھیں۔ البتہ یہ اور بات تھی کہ ان کی اولاد سے ایسی ”وجوہات“ اکثر و بیشتر سرزد ہوتی رہتی تھیں۔  
”ارے صبح سے بھوکے ہونے کا کیا پیار پڑنے کا ارادہ ہے؟ قدسیہ کہے گی اچھی بھابھیاں ہیں جو میری بیٹی کو بھوکا رکھے ہوئے ہیں۔“

”امی ایسا کچھ نہیں سوچیں گے ماما جان! میں نے یونیورسٹی میں برگر لے کر کھالیا تھا۔ اسی وجہ سے بھوک محسوس نہیں ہوئی۔ آپ پریشان ہوں میں اب پچن میں ہی جا رہی ہوں۔“ اس نے مودب اور نرم لہجے میں کہا۔

”ارے لو! یہ برگر شرکر زیادہ مت کھایا کرو، صحت کے لئے مفید کیا ہوتے ہیں الٹا نقصان پہنچانے ہیں۔“ ان کی نصیحت پر اس نے مسکرا کر

سراٹبات میں ہلایا۔

”امی بازاری چیزوں سے یونہی الرجک رہتی ہیں۔ اگر کبھی کھالو تو بھولے سے بھی امی کے سامنے نام مت لینا۔ ورنہ حفظانِ صحت کے اصولوں پر مبنی دو گھنٹے سے کم کا پرمغز پچھر سننے کو ملے گا۔“ زرینہ بیگم کے جانے کے بعد شامل نے اسے آگاہ کیا۔

”میں خود بھی بازاری چیزیں کھانے سے پرہیز ہی کرتی ہوں۔ لیکن آج بھوک زوروں کی لگی ہوئی تھی اور آج یونیورسٹی میں دوسرا دن تھا میرا۔ جب تک میں ڈھونڈ، ڈھونڈ کے کلاس روم تک پہنچی تھی۔ پیرڈ آف ہو چکا تھا۔ بس سارا دن پر پڈ ہی ہوئی رہی میری اور تم اکیلی نظر آ رہی ہو۔ وہ تمہاری ہمزاد شمرین کہاں ہے؟“ وہ دونوں ایک دن ہی پیدا ہوئی تھیں اور ایک ہی کالج میں ایک ہی کلاس میں پڑھ رہی تھیں۔ اسی وجہ سے مسفرہ انہیں ہمزاد کہتی تھی۔ البتہ شامل جتنی شوخ اور چیل تھی۔ شمرین اتنی ہی سنجیدہ اور پڑھا کو تھی۔  
”اس کا کالج ٹیسٹ ہے۔ اپنے کمرے میں بیٹھی وہی یاد کر رہی ہے۔“ لاپرواہی سے کئیدھے اچکاتے ہوئے اس نے اطلاع فراہم کی تھی۔

”تو پھر یقینی بات ہے تمہارا بھی ہو گا۔“ مسفرہ نے اسے گھورا۔

”شمرین زندہ باد! میرے حصے کا بھی وہی یاد کر لے گی۔“ اس کے گھورنے کی طعنی پر وہاں سے پہلے کہ مسفرہ اسے کچھ کہتی زرینہ بیگم نے اسے آواز میں دینا شروع کر دیں اور اس دفعہ اس نے اٹھ کر کھانا کھالیا نہی مناسب سمجھا۔

یوسف علی اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کی تین اولادیں تھیں۔

زریون، صوما، شامل اس کے بعد قدسیہ تھیں۔ ان کے دو بچے تھے، حمران، مسفرہ اس کے بعد آفتاب تھے۔ جن کی تین اولادیں تھیں۔ عون، بابا، منیب، پھر سعد تھے۔ ان کی بھی دو اولادیں تھیں شمرین اور ارحم۔

چاروں بہن بھائیوں میں بہت زیادہ پیار تھا۔ قدسیہ بیاہ کر گوجرانوالہ گئی تھیں جب کہ تینوں بھائی ملتان میں تھے۔ آگے اولادوں میں بھی بہت زیادہ محبت تھی۔ سب آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ مسفرہ ذکر یا یونیورسٹی میں پڑھنے کی فرض سے ملتان آئی تھی۔ اس کا ارادہ تو ہاسٹل میں رہنے کا تھا۔ کیونکہ اپنے ماموؤں کے گھر وہ اپنے بچپن میں ہی ایک دیوہار آئی تھی اور یہاں رہ کر بڑھنے سے بچکا رہی تھی۔ لیکن یوسف ماموں کو علم ہوا تو انہوں نے اسے یہیں رہنے کی تاکید کی اور پھر ایک جتنے میں ہی وہ ان سب سے مل گئی۔ اس سے پہلے وہ صرف زریون کو جانتی تھی۔ کیونکہ وہ چند ایک بار ان کے گھر جا چکا تھا اور جب سے مسفرہ ملتان آئی تھی۔ زریون سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ کیونکہ اُس کے سلسلے میں زریون اور عون دو ہی گئے ہوئے تھے۔

گیت پہ کانی دیر سے تیل ہو رہی تھی وہ لان میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ چوکیدار شامل کی کام سے گوار میں گیا تھا۔ آخر کار وہ ہی اٹھ گئی۔  
”جی آپ کون؟“ دروازے پہ ایک اجنبی کو دیکھ کر اس نے کچھ جھجھک کر دریافت کیا کیونکہ وہ یہاں نئی تھی اور آنے والے کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کون ہے البتہ اگر وہ خود بتا دیتا تو اس کی مشکل آسان ہو جاتی۔

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا ہم جواب میں کیا دیتے تھو گئے سوال میں مقابل نے جواب دینے کی بجائے کانی

## اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

135/-	اردو کی آخری کتاب
200/-	خمار گندم
225/-	دنیا گول ہے
200/-	آوارہ گرد کی ڈائری
200/-	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
130/-	چلتے ہو تو چین کو چلے
175/-	گمری گمری پھر اسافر
200/-	خط انشاجی کے
165/-	بہستی کے اک کوپے میں
165/-	چاند نگر
165/-	دل وحشی
250/-	آپ سے کیا پردہ
	ڈاکٹر مولوی عبدالحق

200/-	قواعد اردو
160/-	انتخاب کلام میر
	ڈاکٹر سید عبداللہ
160/-	طیف نثر
120/-	طیف غزل
120/-	طیف اقبال

لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور

فون نمبر: 7310797-690-7224



دیکھی سے اسے دیکھتے ہوئے شعر پڑھا تھا۔  
مسفرہ کی تیوری پہل پڑ گئے۔

”کیسی ہو مسفرہ؟ یہ عون ہے۔“ زریون اس کے عقب سے نکل کے آیا تھا۔ وہ کیسی والے کو کراہ دے رہا تھا۔ اسی لئے بعد میں آیا تھا۔  
”او..... تو تم مسفرہ ہو کیسی ہو؟“ اب کی دفعہ اس نے نہایت خوش اخلاقی سے دریافت کیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں، آپ لوگ اندر تو آ جائیں۔“ ایک طرف ہٹتے ہوئے اس نے انہیں راستہ دیا۔  
عون سفری بیگ کو تقریباً گھسیٹتا ہوا اندر کی طرف بڑھا۔

”گھر میں سب خبریت سے ہیں، پیچھو، حمران، اٹکل ٹھیک ہیں سب؟“ لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے زریون نے اس سے پوچھا۔  
”سب ٹھیک ہیں، آپ کا ٹور کیسا رہا؟“ بالکل برقیٹ۔

”ماشا اللہ آگے میرے بیٹے!“ زریون بیگ نے آگے بڑھ کے دونوں کے ماتھے چومے۔  
”ہائے تائی امی! جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔“ عون نے صوفے پر دھپ سے گرتے ہوئے ہائے والے شروع کر دی۔  
”تو بیٹا! تم فون کر دیتے ارحم یا نبی تمہیں لینے آ جاتے۔“ زریون بیگم حلاوت آمیز لہجہ میں بولیں۔

”تائی امی! یہ ہائے دائیر آ رہے ہیں۔ کون سا پیدل آئے ہیں۔ جویوں ہا ہا کار بھائی ہوئی ہے۔“ ماہا جوان کے لئے پانی لے کر آئی تھی۔ تب کے بولی۔ اس کی اور عون کی کم کم ہی بنتی تھی۔ بلکہ عون کی کسی سے بھی کم ہی بنتی تھی۔

”مجھے بس کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ ذرا سے ہاتھ پاؤں ہلانے پڑ جائیں تو بونٹی مجھے دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ بس ایک کام کرنا

جھوٹ ہو تمہارے واسطے۔ باقی سب تو خبر ہی ہے۔“ کلثوم بیگم تو پہلے ہی اس کی حرکتوں سے خار کھائے بیٹھے تھیں۔ اب جو موع ہاتھ آیا تو اس کے لئے لے ڈالے۔

”امی! آپ بھی بس۔“ وہ روہانے لہجہ میں فضا کی قدر کر رہی تھی۔ البتہ عون کا چھت چھاڑ قبضہ اسے سخت ناگوار گزارا تھا۔

”کوئی بات نہیں ڈیر سسر! کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔“ عون نے خاصی ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ تو وہ غصے سے دھپ دھپ کرتی بیڑھیاں چڑھ گئی۔

”دیکھا، غصہ تو اس لڑکی کے ناک پر دھرا رہتا ہے۔“ کلثوم کے لہجہ میں اس کے لئے ملامت تھی۔

”چھوڑیں چچی جان! خود ہی سمجھ جائے گی وقت کے ساتھ ساتھ۔ آپ مت ڈانٹا کریں۔“ زریون نے اس کی فیور کی۔

”کھانا کھاؤ گے تم لوگ؟“ زریون بیگم کی مداخلت سے بات آئی گئی ہو گئی۔

”مجھے تو بھوک نہیں ہے۔ میں کچھ دیر ریست کروں گا۔ عون سے پوچھ لیجئے۔ ہاں ایک کپ چائے بھجوا دیجئے گا۔“ صوفے کی ٹیک سے اپنا کوٹ اٹھاتے ہوئے زریون نے جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”میں بھی اسرونگ سی چائے پیوں گا۔“

عون نے وہیں ٹانگیں پھارتے ہوئے کہا۔ مسفرہ پہ نظر پڑی۔ تو ایک دم یاد آئے۔ پوچھنے لگا۔

”میرا خیال ہے تم ذکر یا یونیورسٹی سے ایم ایس سی ہائی کر رہی ہو۔“

”اتنا درست خیال آپ کے دماغ میں کیسے آیا۔“ اس کے درست بیان پر وہ واقعی حیران رہ گئی تھی۔ کہاں تو وہ اسے بچان نہیں پارہا تھا اور کہاں اس کے بارے میں اتنی معلومات۔

”حمران مت ہونا مجھے ٹیلی میٹھی کا علم قطعاً نہیں آتا۔ دراصل ہمارے جانے سے پہلے تاپا ابو نے ایک دن ذکر کیا تھا۔ تو میرے ذہن میں رہ گیا۔ ویسے جب میں ایک دفعہ تمہارے گھر آیا تھا تو تم خاصی چھوٹی ہوئی تھیں۔ میں نے تو تمہیں بالکل نہیں پہچانا۔“ اپنی ٹانگوں کو قدرے سینٹے ہوئے وہ بولا تھا۔

”میں نے جب آپ کو دیکھا تھا تو آپ بھی خاصے چھوٹے تھے۔ میں نے بھی آپ کو بالکل نہیں پہچانا۔“ وہ بالکل اسی کے لہجہ میں بولی۔ تو وہ تہقیر لگے ہنس پڑا۔

”اپنے مزاج کی گنتی ہو۔ خوب گزرے گی جوں جوں گے ہم مزاج دو۔“ اس کے انداز کو اس نے کافی انجوائے کیا تھا۔

اسی دوران کلثوم چائے لے کے آ گئیں۔ تو وہ چائے پینے لگا۔ وہ بھی اپنی کتابیں سمیٹنے کی غرض سے لان میں آ گئی۔

پھر آنے والے دنوں میں وہ زریون اور عون کے متعلق کافی کچھ جان گئی تھی۔ زریون سنجیدہ، محنتی اور ذہین لڑکا تھا۔ بڑے ماموں اس پر فخر کرتے تھے۔ تو کچھ ایسا بے جا بھی نہ تھا۔ ان کے پھیلے ہوئے کاروبار کو اس نے جس طرح سنبھالا ہوا تھا۔ یہ اس کی ہی ہمت تھی۔ مسفرہ اس سے کافی امپر بس ہوئی تھی۔ البتہ عون اس کے برعکس تھا۔ ہر وقت غیر سنجیدہ رہتا غالباً اس کی ہابی تھی۔ وہ جو شروع میں اس کے برجستہ جملوں اور برل شعر بڑھنے پر خائف رہتی تھی، اب اس کی عادی ہو گئی تھی۔ کیونکہ عون کا ایسا رویہ صرف اس کے ساتھ خاص نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہ سب کے ساتھ ایسے ہی پیش آتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی امی اور تائی کو بھی نہیں چھوڑتا تھا۔

چھٹی کا دن ہونے کے باعث سب ہی لیٹ

اٹھ رہے تھے۔ صبح سے بخانے کتنی مرتبہ ڈائینگ ٹیبل پہ ناشتہ لگ چکا تھا۔ سب سے آخر میں زریون اٹھا تھا۔ وہ لوگ اب دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

”ناشتہ لاؤں آپ کے لئے زریون بھائی!“ مسفرہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”ناشتہ رہنے دو صرف چائے لا دو۔ اب اکٹھا لیج ہی کر لوں گا۔“ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے کہا تو مسفرہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کچن میں آ گئی۔

چائے کے ساتھ اس نے سینڈوچ میکر میں جلدی سے دو چار سینڈوچ تیار کر لئے۔

”میں نے صرف چائے کا کہا تھا۔“ زریون نے اسے چائے کے ہمراہ سینڈوچ لاتے دیکھ کر کہا۔

”لیج تیار ہونے میں ابھی کچھ ٹائم ہے۔ تب تک آپ کوئی ہلکی چھلکی چیز لے لیں۔“ مسفرہ نے ٹرے اس کے سامنے رکھی۔

”ایک بات پوچھوں آپ سے زریون بھائی!“ وہ خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”پوچھو، اس میں اجازت لینے والی کون سی بات ہے۔“ اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح نرم تھا۔

”لی وی پر اس وقت پاکستان کا بیچ آ رہا تھا۔ سارا گھر اس وقت لی وی کے سامنے موجود تھا۔ سوائے صوما، ماہا اور مسفرہ کے کیونکہ وہ تینوں اس وقت بیچ کی تیاری کر رہی تھیں۔“

”آپ اتنی دیر تک کیوں جاگتے رہتے ہیں۔ سارا دن بھی آپ کو آرام کرنے کا وقت کہاں ملتا ہے اوپر سے آپ واپسی پہ سارا دفتر گھر اٹھا لیتے ہیں اور کل تو آپ ساری رات جاگتے رہے ہیں۔ مانا کہ ضروریات زندگی کے لئے پیسہ اہم ہے۔ لیکن اتنا بھی اہم نہیں کہ انسان اپنی طرف سے بالکل ہی غافل ہو کے رہ جائے۔“



زریون نے بے حد چونک کر اسے دیکھا۔ بلیک اور پیچ کلر کے ہینڈ ڈائیمز انڈری والے سادہ سے سوٹ میں بھی وہ اسے کچھ خاص لگی تھی۔ شاید اس نے اس کی طرف کی جو فکر مندی دکھائی تھی، یہ اس وجہ سے تھلا۔ کیونکہ زریون نیگم کے علاوہ ایسی نصیحت اسے بھی کسی دوسرے نے نہیں کی تھی۔  
”تمہیں کیسے معلوم کہ میں ساری رات جاگتا رہا ہوں۔ کیا تم ساری رات میرے کمرے کی نگرانی کرتی رہی ہو۔“ چائے کا سیب لیتے ہوئے اس نے جاچتی نظروں سے اسے دیکھا۔  
”ارے نہیں۔“ وہ دھڑے سے مسکرائی۔  
”میں کیوں کرنے لگی آپ کی نگرانی، دراصل کل میری پریزینٹیشن ہے اسی وجہ سے میں رات کو دیر تک اسٹڈی کرتی رہی۔ اس دوران جب بھی میری آنکھ آپ کے کمرے کی طرف گئی لائٹ جلتی ہوئی ہی نظر آئی۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ صبح فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سوئے تھے۔“  
”داد دینی پڑے گی تمہارے درست اندازوں کی۔“ وہ اندر ہی اندر خاصا حیران ہوا تھا۔

”آپ اتنی جان کیوں کھیلتے ہیں زریون بھائی! عون بھی تو ہے اسے بھی کچھ ذمے داری سکھائیں۔ مانا کہ وہ آپ سے چھوٹا ہے، لیکن اب اتنا بھی چھوٹا نہیں۔ اسے اگر خود احساس نہیں تو کم از کم آپ تو یہ احساس اسے دلا سکتے ہیں۔“  
”ضرور دلا سکتا ہوں۔ اگر تم یہ فکر مندی پہلے ظاہر کر دیتی تو میں سے یہ احساس پہلے سے دلا دیتا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے لہجے میں اسے چھیڑا۔

”مجھے علم نہیں تھا۔ آپ میرے فکر مند ہونے کے منتظر ہیں۔ ورنہ ضرور پہلے ہی ایسا کر لیتی۔“ اس نے بھی دودھو جواب دیا۔ زریون اسی کی بات پہ کافی محفوظ ہوا تھا۔

”ویسے تم چائے بہت مزے کی بناتی ہو۔“ وہ جو صرف چائے پینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس سے باتوں کے دوران چائے کے ساتھ ساتھ سینڈویچ بھی کھا گیا تھا۔

”جیسے پتہ ہے ویسے تعریف کا شکریہ۔“ مسفرہ نے برتن اس کے سامنے سے سیٹھ۔  
”کیا اتفاق نے بتایا ہے؟“ وہ جو چکن کی طرف رخ موڑنے ہی والی تھی۔ ایک دم ٹھٹھک گئی۔ اتفاق اس کا پچازاد اور سنگیتر تھا۔ اگر چنانچہ دونوں کی باقاعدہ کوئی رسم وغیرہ نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بچپن سے ہی دونوں بھائیوں نے آپس میں گویا ایک عہد سا کر رکھا تھا۔

وہ خود بھی نہیں جانتا تھا اس نے اتفاق کا نام کیوں لیا تھا۔ شاید بلا ارادہ ہی اس کی زبان سے پھسل گیا تھا۔

”نہیں بہت سے لوگوں نے، کہا اتفاق کی سند ضروری نہیں؟“ وہ اتفاق کو اگر پسند نہیں کرتی تھی تو نا پسند بھی نہیں کرتی تھی۔ بابا جان نے اسے اس رشتے کے متعلق اس وقت آگاہ کیا تھا۔

جب وہ اچھی طرح ہوش و حواس سنبھال چکی تھی۔ نہ صرف اسے آگاہ کیا تھا بلکہ اس معاملے میں اس کی رائے بھی مانگی تھی اور اتفاق عالم میں ایسی کوئی خالی نہیں تھی جو وہ اس کو ریجیکٹ کر لی اور نہ ہی اس کا اپنا انٹرنسٹ کسی اور کی طرف تھا۔ سو اس نے سہولت سے اقرار کر لیا تھا۔ ہاں اتفاق عالم اس کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے یہ اسے نہیں معلوم تھا۔ اگرچہ وہ اکثر اوقات ان کے گھر آ جایا کرتا تھا۔ لیکن مسفرہ کی بھی اس سے زیادہ لمبی چوڑی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود بھی لیے دیئے انداز میں رہتا تھا۔

”نہیں سند تو کسی کی بھی ضروری نہیں۔“ زریون نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ پھر سامنے رکھا اخبار اٹھا کے دیکھنے لگا۔ مسفرہ سر

جھٹکتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

-----

”مسفرہ! حمران بیٹے کا فون آیا ہے۔“ وہ صوما وغیرہ کے ساتھ بھی مزے سے چپس کھا رہی تھی جب کلثوم نے اسے آواز لگائی۔ چپس وہیں چھوڑ چھاڑ کے وہ بھاگ بھاگ ٹیلیفون اسٹینڈ تک پہنچی۔

”لو آگئی ہے کرلو بات۔“ کلثوم نے مسکراتے ہوئے ریسورس کی طرف بڑھایا۔  
”ہیلو! حمران بھائی! کیسے ہیں آپ؟“ ریسورس تھا جیسے ہی وہ بے تاب سی بولی۔

”تمہاری جلد بازی والی عادت نہیں گئی۔“ اس کی بھولی ہوئی سانسوں کو محسوس کرتے ہوئے حمران مسکرا دیا۔ اسے علم تھا وہ جہاں کہیں بھی ہو گی بھاگتی ہوئی اس کا فون سننے کے لئے آئی ہو گی۔

”پرانی عادتیں اتنی جلدی تھوڑا چھوٹی ہیں اور میری تو ویسے بھی ساری عادات اپنے بڑے بھائی پر پڑی ہیں۔“ وہ فون پہ بھی اس پر چوٹ کرنا نہیں بھولی تھی۔ دوسری طرف حمران کی مسکراہٹ قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔

”لگتا ہے امی گھر پہ موجود نہیں ہیں اسی لئے چھت پھاڑ قہقہے گونج رہے ہیں۔“ قدسیہ کو اونچی آواز سے قہقہے لگانا کتنا نا پسند تھا وہ دونوں ہی جانتے تھے۔ اس لئے ان کی کوشش ہوئی تھی کہ والدہ کی موجودگی میں صرف مسکرانے پہ اکتفا کیا جائے۔

”تمہارے درست اندازوں کا تو میں شروعات سے ہی قائل ہوں۔“ حمران کے لہجے میں حسین تھی۔

”امی برابر والوں کی عیادت کے لئے گئی ہیں۔“

”تم سناؤ یہاں سب ٹھیک ہیں اور تمہاری

بڑھائی کیسی چل رہی ہے کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی۔“ وہ بات بدل کر پوچھنے لگا۔

”میری طرف سے آپ بے فکر ہو جائیں اے گریڈ لے کر آؤں گی انشا اللہ اور رہی بات یہاں کی، تو یہاں سب بہت بہت اچھے ہیں۔ مجھے ایڈ جسٹ ہونے میں بالکل ٹائم نہیں لگا۔ ہاں البتہ امی، بابا اور آپ یاد آتے ہیں۔“ آخر میں وہ کچھ افسردہ ہو گئی۔

”کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہے سویت سسر! میں آؤں گا تم سے ملنے۔ بس ابھی ایک دو ضروری کاموں میں پھنسا ہوا ہوں۔“ وہ خود بھی تو اس کے بغیر اداس ہو گیا تھا۔ جب سے وہ گئی تھی ان کے گھر کی رونق ہی ختم ہو گئی تھی۔

”امی اور بابا جان کیسے ہیں؟“  
”سب ٹھیک ہیں اور تمہارے بغیر نہایت پرسکون ہیں۔“ اس کا انداز سرا سر چھیڑنے والا تھا۔

”ٹھیک ہے تو پھر میں ہی رہ لیتی ہوں ہمیشہ کے لئے۔“ اس نے بھی مصنوعی حلقی دکھائی۔

”ارے ارے ایسا مت کرنا خدارا! اتفاق بیچارے نے کیا گناہ کیا ہے جو تم یہیں رہنے لگی ہو اور ہم عالم چچا کو کیا منہ دکھائیں گے۔“ حمران نے نہایت فضول بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ اس کی بات سمجھ میں آتے ہی وہ جھل سی ہو گئی۔

”اچھا سویت سسر! گیٹ پہ نیل ہو رہی ہے۔ میں ٹیچر فون کروں گا، اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ اس نے ریسورس کرڈل پہ ڈال دیا۔

”ویسے اگر عالم چاچو کے گھر کی بجائے میری مٹکئی یہاں ہو جاتی تو کتنا مزہ آتا، یہاں ہر وقت رونق لگی رہتی ہے اور عالم چاچو کے گھر تو ہر وقت سنائے بولتے ہیں۔“ یہ خیال ابھی ابھی اس



کے ذہن میں آیا تھا۔  
”یہاں اگر ہوتی تو کس کے ساتھ؟ غیب اور ارحم تو مجھ سے ویسے ہی چھوٹے ہیں اور عون..... لیکن عون تو اتنا لالباہی اور غیر سنجیدہ سا لڑکا ہے بابا جان اسے تو ہرگز میرے لئے منتخب نہ کرتے تو کیا زریون بھائی.....“ یہ خیال ہی ذہن میں کچھ اس طریقے سے ابھرا تھا کہ وہ فوراً بولکلا کے کھڑی ہوگئی۔

اور اسی بولکلا ہٹ میں چلتے ہوئے عین سامنے سے آتے زریون سے ٹکرائی سر اٹھا کے اس نے جونہی سامنے دیکھا۔ زریون کو مقابل دیکھ کے وہ بری طرح پھرا کے رہ گئی۔ اس کا تصور مجسم حقیقت بن کے اس کے سامنے موجود تھا۔

وہ ایک دم ہی اس کے پہلو سے نکلے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بھاگی گئی۔ زریون اس کی حرکت پر خاصا حیران ہوا تھا۔

”خبردار مسفرہ! جو تو نے آئندہ ایسی کوئی الٹی سیدھی بات سوچی۔“ دھپ سے بیڈ پر گرتے ہوئے اس نے خود کو ڈیٹا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو جو اس وقت بستر سنبھالے ہوئی ہو۔“ ماہانے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

”ہوں، بس ویسے ہی۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تو پھر آ جاؤ، ہم لڈو کھینے لگے ہیں۔“ ماہا کی آفر پر وہ فوراً اٹھ کے پیچھے چل پڑی۔ عون شنگ روم میں لڈو پھیلانے بیٹھا تھا۔

”جس نے کھیلنا ہے آ جائے۔“ اس نے بڑی شان سے سب کو دعوت دی۔

”میں اس مکار کے ساتھ ہرگز نہیں کھیلوں گی۔“ صوما کو اپنی کچھ دن پہلے والی شکست ہرگز نہیں بھولی تھی۔ جب عون نے اس کی ہزار ہا منت سماجت کے باوجود اسے بری طرح ہرایا تھا۔

”تمہاری کوئی منتیں بھی نہیں کر رہا۔“ اس نے آنکھیں کھٹکے اسے دیکھا۔

”میں تو کھیلوں گی۔“ ماہا جھٹ سے بولی۔

”میں بھی۔“ غیب نے بھی حصہ لیا۔

”اور تم؟“ وہ مسفرہ کی طرف مڑا۔

”میں بھی۔“ دیکھی سے کہتے ہوئے وہ بھی ان تینوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔

اور پھر یہ تو اسے کھیل کے دوران معلوم ہوا کہ صومانے کیوں عون کے ساتھ نہیں کھیلا تھا اور بہت اچھا ہی کیا تھا۔ وہ تو بری طرح پھنسی تھی۔

عون کم بخت کو نمبر زبھی تو اتنے آتے تھے۔ اس کی قوتوں گوئیں وہ بری طرح پٹا چکا تھا۔ اب آخری رہ گئی تھی۔

”ہائے عون! اسے تو نہ مارو پلیز! یہ میری آخری گوٹ رہ گئی ہے۔“ عون کے نمبر زدیکھ کے وہ روہاکی ہو گئی لہجے میں منت ہی منت تھی۔

روٹھ جاتے ہو تو کچھ اور حسین لگتے ہو یہی سوچ کے ہم نے تم کو کھنا سا رکھا ہے

اس کی چوٹی گوٹ بھی پیٹتے ہوئے عون نے بڑے جذبے سے شعر پڑھا اور اس کے عین سامنے پڑی ہوئی تینوں گوٹوں کے اوپر چوٹی گوٹ بھی رکھ دی۔

”مجھے نہیں کھیلنا تمہارے ساتھ۔“ غصے میں آکر اس نے ساری لڈو ہی الٹ دی۔

”ہارنے کا ظرف بھی ہونا چاہیے انسان میں۔“ اس کی اندرونی کیفیت سے محفوظ ہوتے ہوئے عون نے کہا تھا۔

”تو تم خود کیوں نہیں مار جاتے۔“ مسفرہ نے چڑکرتیکے چتون سے اسے گھورا۔

وہ عشق کی بازی جہاں مجھ سے جیتنا چاہے میں وہیں مان لوں گا مات، اس سے کہہ دینا

”بس ایک ہی کام آتا ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ فرحت اس کے پاس جا کے کھڑی ہوگئی۔ شاید یہی اس کا بھائی تھا اس کی تھلید میں رکتے ہوئے مسفرہ نے سوچا۔ فرحت نے اس لڑکے سے کچھ گفتگو کی تھی۔ لیکن ٹریفک کے شور میں اس کی دھیمی آواز دب سی گئی تھی اور مسفرہ کا تو سراٹا دکھ رہا تھا کہ حد نہیں۔

”ہیلو! نائکس ٹو میٹ یو۔“ وہ اب اس کی طرف متوجہ ہو کر مسکرایا تھا۔

شاید وہ اپنی بہن کی دوست سے مروت نبھا رہا تھا۔ کم از کم مسفرہ کو تو یہی لگا تھا۔

”می ٹو۔“ زبردستی خود کو مسکرائے یہ مجبور کرتے ہوئے وہ بمشکل دو لفظ بول پائی تھی۔

”مسفرہ! یہ میرے بھائی اسفند ہیں۔“ فرحت کے تعارف پہ وہ صرف اثبات میں سر ہلا سکی تھی۔

شکر تھا کہ ان کے بیٹھے ہی اس نے گاڑی اشارت کر دی تھی۔

”مس مسفرہ! آپ کے گھر کا ایڈریس؟“ وہ اسپنڈ آہستہ کرتے ہوئے چہرے کو قدرے پیچھے موڑ کر اس سے دریافت کر رہا تھا۔

مسفرہ نے ایڈریس بتایا تو وہ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے گاڑی اس کے گھر کے سامنے روک گیا۔

”تھینک یو سوچ! آپ لوگ اندر آئیں ناں۔“ اترنے سے پہلے اس نے اخلاقیات ان دونوں سے کہا تھا۔

”آج ہم جلدی میں ہیں پھر کبھی سہی۔“ معذرت فرحت کی بجائے اس کے بھائی کی طرف سے آئی تھی۔ نجائے کیوں مسفرہ کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اسفند نے بہت گہری نظروں سے اسے دیکھا ہے۔

”آج میرا دماغ ہی خراب ہے اور دوسری

لیب سے باہر نکلتے ہی اس نے رسٹ واپج پہ ٹائم دیکھا۔ جہاں ساڑھے چار بج رہے تھے۔ دین والا تو اپنے ٹائم پہ جا چکا تھا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ گھروں کر دے غیب یا ارحم میں سے کوئی اسے لینے آ جائے گا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ جھنجھلائی گھر کا فون تو پچھلے دو تین دنوں سے ڈیڈ پڑا تھا۔

”تم نے نہیں جانا مسفرہ! جو یہیں کھڑی ہو۔“ اس کی کلاس فیلو فرحت نے اس کے قریب آتے ہوئے پوچھا تو وہ اپنی سوچوں کو جھٹکتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”یہی تو سوچ رہی ہوں کیسے جاؤں؟ بی بی سی ایل نمبر تو خراب ہے دو دنوں سے ورنہ گھر فون کر کے کسی کو بلوائی، ایک تو مجھے یہاں کے روڈ سے آشنا نہیں۔“

”نو پرائیم یار! ڈونٹ یو وری۔ آؤ میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔“ فرحت نے اسے تسلی دینے کے ساتھ ساتھ اس کا مسئلہ بھی حل کر دیا تھا۔

”لیکن تم تو صبح بتا رہی تھی کہ تمہاری گاڑی سروس کے لئے گئی ہوئی ہے اور تمہیں تمہارے بھائی ڈراپ کر کے گئے ہیں۔“ اس کی آفر پر وہ حیران ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”تو کیا بھائی صرف ڈراپ کر سکتے ہیں پک کرنے نہیں آ سکتے۔“ فرحت کی بات پہ اس کا جی چاہا۔ اپنا سر پیٹ ڈالے۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی اور وہ یوں ہونٹوں کی طرح دریافت کر رہی تھی جیسے مسئلہ فلسطین ہو شاید اس کا دماغ ہی گھوما ہوا تھا۔

فرحت کے ہمراہ وہ یونیورسٹی کے گیٹ سے اگلی۔ چند قدم کے فاصلے پہ وائٹ کرو لاکھڑی تھی اور ایک اسمارٹ سال لڑکا کلاسز چٹھائے گاڑی



ہیات کوئی نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا پھر ایک مرتبہ ٹھیکس اکین ہتی ہوئی نیچے اتر گئی۔

”میں تمہاری طرف سے بہت فکر مند ہو رہی تھی۔ اب تمہارے ماموں کو فون کرنے والی تھی کہ عون یا زریون کو بھیجی مسفرہ کو لے آئیں۔“ اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کا سامنا زرینہ بیگم سے ہوا تھا۔ اس کے سلام کے جواب میں وہ خاصی فکر مندی سے بولیں۔

”مجھے کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا ماما جان! ایک دوست کا گھر میرے رستے میں ہی آتا ہے وہ بھی یہاں تک چھوڑ گئی مجھے۔“ ان کے پاس رک کے اس نے ان کو لکھی کرنا چاہی۔

”اچھا! اللہ اسے جزائے خیر دے تم ہاتھ منہ دھو لو میں شامل سے کہتی ہوں تمہارے لئے کھانا گرم کر دے۔“

”میں پہلے نہاؤں گی ماما جان! تھکاوٹ بہت زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔“ وہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

فریش ہو کے جب وہ لاؤنج میں آئی تو عون کے ساتھ ساتھ زریون بھی وہاں موجود تھے۔

”آپ آج اتنی جلدی آگئے۔“ اس سے کچھ فاصلے پہ رکھے ہوئے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے مسفرہ نے حیرت سے دریافت کیا تھا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی اکثر اوقات اسے لیٹ ٹائٹ ہی آتے دیکھا تھا۔ آج اتنی جلدی اسے سامنے دیکھ کر اسے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔

”دونوں پہلے جو اتنا پر مغز پیچر سننے کو ملا تھا یہ اسی کا نتیجہ ہے۔“ اس کے جواب پہ مسفرہ بے ساختہ ہنسی گئی۔

زریون کی نظر بے اختیار ہی اس پہ جم گئی۔ ٹی پٹک کل میں فریش کھلا کھلا چہرہ بے حد بھلا محسوس ہو رہا تھا۔ کیلے بال پشت پہ بھرے تھے مولی

پکاتے ہوئے اتنے بے تکلف حلیے میں زریون نے اسے کم کم ہی دیکھا تھا۔ وہ اکثر بال باندھ کر رکھتی تھی اور یقیناً اچھا ہی کرتی تھی۔

”آپ اتنے فرمانبردار ہوں گے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔“ اس کی آواز ایک دم ہی اسے ”بے اختیاری“ کے پرفسوں لحوں سے کھینچ لائی تھی۔

”یہ کس وقت کا کھانا ہے؟“ شامل نے کھانے والی ٹرے لا کے اس کے سامنے رکھی۔ تو زریون نے عجب سے سوال داغا۔

”یہ کھانا تو اصل میں دوپہر کا تھا لیکن لیٹ ہو گیا۔“

”لیٹ ہو گیا؟“ زریون نے نا سمجھ انداز میں شامل کو دیکھا۔

”دراصل آج میرا پریکٹیکل تھا بس اسی وجہ سے یونیورسٹی میں ہی دیر ہو گئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے لوٹی ہوں۔“ کھانا دیکھ کے اس کی بھوک نئے سرے سے چمک اٹھی۔ لیکن پہلے اس نے جواب دینا مناسب سمجھا۔

”زریون بھائی! آپ کھانا کھائیں گے۔“ شامل نے جاتے جاتے پلٹ کے پوچھا۔

”نہیں! میں اب ڈنر ہی کروں گا اور تم اتنی دیر سے کس کے ساتھ آئی تھی؟“ شامل کو جواب دینے کے بعد وہ مسفرہ کی طرف متوجہ ہوا جو بڑی رغبت سے کھانا کھا رہی تھی۔

”ایک دوست ڈراپ کر گئی تھی ورنہ میں تو ٹیکسی سے آنے کا سوچ رہی تھی۔“ گرم گرم نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”آئندہ اگر تمہیں کسی وجہ سے دیر تک رکنا پڑے تو مجھے فون کر دینا میں تمہیں لینے آ جاؤں گا۔ ٹیکسی وغیرہ کے چکروں میں پڑنے کے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”یہ خیال آج بھی میرے ذہن میں آیا تھا

پھر میں نے سوچا تھا اگر آپ کسی بزنس میٹنگ وغیرہ میں مصروف ہوئے تو خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گے۔ اتنے فالکوں کے ڈھیر تو آپ کے روم میں پڑے رہتے ہیں پھر آؤں میں مصروفیت کا کیا عالم ہوگا۔“

”میری مصروفیت اور بزنس میٹنگز اب اتنی بھی اہم نہیں کہ تمہاری وجہ سے انہیں چھوڑ نہ سکوں۔“ مسفرہ کا منہ کی طرف بڑھتا ہوا لقمے والا ہاتھ وہیں ساکت رہ گیا تھا۔ کچھ ایسا ضرور تھا اس کے لچے میں جس نے ایک پل کے لئے اسے چونکا دیا تھا۔

”بھئی پچھو نے تمہاری ذمہ داری ہم پر ڈالی ہے تو اسے پورا بھی تو کرنا ہے۔“ اسے شاید خود بھی اپنے کہے گئے جملے کا احساس ہو گیا تھا۔ اسی لئے ہلکا جھلکا انداز اختیار کیا تھا۔ البتہ اپنے بدلتے ہوئے احساسات پہ وہ خود اندر ہی اندر خائف سا ہو گیا تھا۔

”یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔“ مسفرہ بھی میری کزن ہے بانی گزنز کی طرح۔“ رات کو اپنے بستر پہ لیٹے وہ خود باور کروا رہا تھا۔

”لیکن کوئی تو ایسی بات اس میں ہے جو زریون پوسٹ کو اپنی اٹھائیس سالہ زندگی میں کسی اور میں نظر نہیں آئی۔“ اس کے دل سے آواز آئی۔

”شاید میں ضرورت سے زیادہ اس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ ورنہ میں مسفرہ سے کون سا پہلی مرتبہ مل رہا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے صرف ریکی علیک سلپک ہوئی تھی اب کبھی بکھار تفصیل سے بھی گفتگو ہو جاتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے میں اس کے بارے میں اکثر سوچنے لگا ہوں اور پھر وہ تو انا پیڈ ہے۔ مجھے اس میں زیادہ دلچسپی لینا سوٹ بھی نہیں کرتا۔“ خود کو بہلاتے ہوئے کب اس کی آنکھ لگی اسے خود خبر نہیں ہوئی۔

-----

آج اس کے لاسٹ دو پیریڈ فری تھے لہذا وہ جلد ہی گھر آ گئی تھی۔ منیب اپنے کالج سے واپسی پر اسے بھی لیتا آیا تھا۔ ٹرین اور شامل بھی آج جلد ہی کالج سے لوٹ آئی تھیں۔ اب سچ کے بعد ان کی خوب محفل جچی تھی۔

”صوما آئی! اگر کال مل جائے اس وقت تو کیا بات ہے۔“ منیب نے صوما کو دیکھتے ہوئے بڑے خوشداشتانہ انداز اختیار کیا تھا۔

”اور وہ بھی اگر آپ کے ہاتھ کی بنی ہو تو مزہ آجائے۔“ ارحم نے بھی کھڑا لگایا۔

”تم دونوں جتنی کانی پیئے ہو میرا خیال ہے ابو جی کو تمہیں ایک کانی شاپ کھول کے دینی پڑے گی۔“ صوما کو ان کے کانی پیئے سے اتنی چڑ نہیں تھی جتنی کانی بنانے سے تھی۔ خود تو وہ کانی پیتی نہیں تھی اور کسی دوسرے کے لئے کانی بنانا اسے عذاب سے کم نہیں لگتا تھا۔

”ہم دواسارٹ، خوبرو اور حسین نو جوانوں کے لئے صرف ایک کانی شاپ.....“ ارحم کی آنکھیں مصنوعی حیرت سے پھٹنے کے قریب تھیں۔

”ایکونینگ دیکھو اس خبیث کی۔“ صومانے کشن کھینچ کے اسے دے مارا جسے بڑی سہولت سے کھینچ کرتے ہوئے ارحم ہنس دیا۔

”مسفرہ! تمہارا فون ہے۔“ ماہا کی اطلاع پر وہ مسکراتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”یقیناً حمران بھائی نے کیا ہوگا۔“ خود سے کہتے ہوئے وہ ٹیلیفون اسٹینڈ تک آئی۔

”آج اتنے دنوں بعد میں آپ کو یاد آ ہی گئی۔ مجھے پتہ تھا آپ یقیناً بھول چکے ہوں گے۔“ ریسور اٹھاتے ہی وہ نروٹھے پن سے بولی۔

روز کہتا ہوں کہ بھول جاؤں گا اسے



ہر روز یہ بات بھول جاتا ہوں میں  
دوسری طرف سے گھبرمر دانہ آواز حمران کی  
تو یقیناً نہیں تھی۔

”آ..... آ..... آ..... سوئی..... میں سمجھی.....  
میرے بھائی ہیں۔“ غیر متوقع آواز پہ وہ بوکھلا  
کے رہ گئی۔

”چلیں اسی بہانے سے آپ نے ہم سے  
شکوہ تو کیا۔“ دلکش انداز میں کہے گئے جملے پہ وہ  
جھٹکی۔

”آپ کون؟“  
”میں اسفند عرض کر رہا ہوں۔“  
”کون..... اسفند.....؟“ وہ واقعی شناخت  
نہیں کر پائی تھی۔

”آپ..... آپ اتنی جلدی بھول گئیں۔“  
وہ صدمے سے چور لہجے میں گویا ہوا۔  
”میں سیریلی کہہ رہی ہوں میں کسی اسفند  
کو..... ایک دم ہی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا  
تھا۔

”ارے..... کہیں آپ فرحت کے بھائی  
اسفند نہیں۔“  
”بھینٹس گاڈ! آپ نے پہچان لیا ورنہ میں  
تو اسی صدمے سے ہلاک ہو جاتا۔“ اس نے بے  
ساختہ شکر ادا کیا تھا۔

”یہ بات نہیں ہے دراصل آپ سے ایک  
دفعہ ہی بات ہوئی ہے تو نام ذہن میں نہیں رہا۔“  
اس نے شائستہ لب و لہجے میں کہا۔

”اور میرے ذہن و دل سے ان دن سے  
ایک نام ہی ٹھوٹھیں ہوا۔“ وہ ذمہ داری لے لیتے ہیں بولا۔  
”میں سمجھی نہیں۔“ وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

”بہت سی باتیں خود سمجھ میں آ جاتی ہیں بس  
تھوڑا وقت لگتا ہے۔“ وہ سابقہ انداز میں گویا  
ہوا۔

”آپ کو کوئی کام تھا مجھ سے.....؟“ اس

کی بے سرو پاپاتوں سے اکتا کر اس نے پوچھا۔  
”کام تو ہے اگر آپ کرنے کی ہائی بھر  
لیں۔“

”اگر مجھ سے ہو سکا تو ضرور کروں گی، آپ  
کہیے۔“

”آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی پھر  
کبھی سہی۔ اپنا خیال رکھیے اللہ حافظ۔“ دوسری  
طرف سے ریور رکھا جا چکا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔“ وہ ہکا بکا سی ریور  
کو تھامے کھڑی رہ گئی۔

”ایڈیٹ..... اسٹوڈنٹس! میں بھلا  
خونخواہ دوبارہ اس سے بات کروں گی مجھے کیا  
ضرورت آن چکی ہے جو اس سے دوبارہ بات  
کروں۔“ یکدم ہی اس کا غصہ عود کر آیا۔

”اور فرحت نے اپنے بھائی کو میرا نمبر  
کیوں دیا۔“ اب اسے فرحت پہ غصہ آنے لگا۔  
”تم کیا ہواؤں سے لڑ رہی ہو۔“ عون نے  
اس کے قریب سے گزرتے ہوئے آنکھوں کے  
سائے ہاتھ لہرایا۔ تو وہ چونک کے اسے دیکھنے  
لگی۔

”تم کب آئے۔“  
”ابھی ابھی جب تم مرا تے میں تھیں۔  
ویسے کیا ریور سے کسی نے تم پر مصور پھونکا تھا۔“  
آواز قدرے دھیمی کرتے ہوئے اس نے خاصا  
راز درانہ لہجہ اختیار کیا تھا۔

”تم مجھی ناں.....“ ریور کریڈل پر ڈالتے  
ہوئے وہ مکرادی۔

”حد کرتے ہو۔“ عون نے اس کا جملہ مکمل  
کیا۔ تو وہ بے ساختہ ہی ہنس دی۔ ایک دم ہی  
اس کی ٹینشن ریلیز ہو گئی تھی۔

لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ ٹینشن اس  
کا مستقل طور پہ در دسر بننے والی ہے۔

”چلو بس کرو بیٹا!“ وہ ممانی جان کے سر  
میں سرسوں کے تیل کی مالش کر رہی تھی۔ وہ جب  
سے یہاں آئی تھی اکثر ان کے چھوٹے موٹے  
کام کر دیا کرتی تھی۔ حالانکہ وہ اسے منع کرتی  
رہتی تھیں لیکن اسے بڑوں کی خدمت کر کے سکون  
ملتا تھا۔

”تھک جاؤ گی مسفرہ!“  
”میں کون سا پہاڑ کھود رہی ہوں ماما جان!  
جو تھک جاؤں گی۔“ اپنے نرم نرم ہاتھ پورے  
آہستگی سے ان کے سر میں چلاتے ہوئے اس  
نے ان کی بات چٹکیوں میں اڑائی۔

”حالانکہ پہاڑ کھودنا زیادہ آسان ہے۔“  
عون اسی وقت ہی ٹپکا تھا۔

”عون.....“ مسفرہ نے سخت نظروں سے  
اسے گھورا۔

زیرینہ بیگم آنکھیں بنے کیے شاید غنودگی  
میں چلی گئی تھیں۔ اسی لئے اس کی بات نہیں سن  
سکی تھی۔

”ماما امی!“ عون نے ذرا سان کا گھٹنا  
ہلایا۔

”ہوں۔“ وہ اسی حالت میں گویا ہوئیں۔  
”شکر ہے، ابھی ہیں۔“ دونوں ہاتھ سینے پہ  
رکھتے ہوئے وہ جس بے ساختہ پن سے بولا تھا۔

مسفرہ کا تہقہہ نکلنے نکلنے رہ گیا۔  
”پورے سخرے ہوئے۔“ وہ شیشی کا ڈھکن  
بند کرتے ہوئے بولی۔

”ویسے آپس کی بات ہے میری امی کہتی  
ہیں تم بالکل اپنی تانی پہ پڑے ہو۔“ اب کی دفعہ  
وہ اپنے تہقہہ کو روک نہیں پائی تھی۔ اس کے بلند  
تہقہے پہ زیرینہ بیگم نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

عون تو کان دبا کے اندر بھاگا۔ مبادا اس کی  
شامت نہ آ جائے۔ وہ آج پھر تانیا ابو سے آنکھ بچا  
کر گھر بھاگ آیا تھا۔

55

سچ مساج کرنے کے بعد مسفرہ ان کے بالوں  
میں لگا بھی کر کے چٹپٹا بنا دی۔

”اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔“ انہوں نے  
اپنی مخصوص دعا دی۔ تو وہ شانت ہو گئی۔

”مکئی اچھی بچی ہے مسفرہ اگر قد سیر  
اس کی بات کہیں اور نہ کی ہوتی تو میں اپنے  
زریون کے لئے اس کا ہاتھ مانگ لیتی۔“ اک  
ہوک سی ان کے دل میں ابھی تھی۔

لاؤنج سے گزرتے ہوئے ٹیلیفون کی گھنٹی  
نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔  
”ہیلو!“  
”ہیلو.....“

”مسفرہ محمود.....؟“ دوسری جانب سے  
تصدیق کی گئی۔

”جی! آپ کون؟“ وہ ٹھٹھکی۔  
”میرا خیال تھا اب مجھے تعارف کی ضرورت  
نہیں پڑے گی۔ کیونکہ میرا تصور مجھے آپ کے  
آس پاس ہی رکھتا ہے۔ شاید یہ کھلی آنکھوں سے  
خواب دیکھنے کا اثر ہے۔“ ایک سرد آہ بھر کے کہا  
گیا تھا۔

”آپ کو اب تعارف کی ضرورت نہیں  
کیونکہ میں پہچان چکی ہوں کہ آپ کون“ ذات  
شریفہ ہیں۔“ وہ لفظ چبا چبا کے بھولی۔

”بھینٹس گاڈ! میرا کوئی خواب تو سچا ہوا۔“  
اس کے لہجے کی کاٹ کو محسوس کیے بغیر وہ اپنی ہی  
ہانک رہا تھا۔

”جی تو چاہتا ہے تمہارے وہ بھی خواب  
پورے کر دوں جو تم نے ابھی دیکھے ہی نہیں۔“  
اس نے گلے کے سوچا۔

”دیکھیں مسفرہ اسفند! میں اس وقت بہت  
بڑی ہوں اور فضول قسم کی باتوں کے لئے میرے  
پاس بالکل نام نہیں ہے۔“ وہ ساری مردت لحاظ  
بااے طاق رکھ کے بولی۔

55



”بڑی تو میں بھی بہت تھا۔ لیکن میں نے آپ کے لئے وقت نکال لیا۔ وقت تو خود نکالنا پڑتا ہے۔“ اس کا میٹھا لہجہ مسفرہ کو تپاہی تو گیا۔  
 ”آئم سو..... سوری مسٹر اسفند! میں آپ کے لئے بالکل وقت نہیں نکال سکتی اور نہ ہی میں نکالنا چاہتی ہوں۔“ دو ٹوک الفاظ میں کہتے ہوئے اس نے تراز سے ریور کریدل پہ بیخ ڈالا۔  
 ابھی وہ چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ جب ٹیلیفون کی بیل دوبارہ بج اٹھی۔  
 ”ہیلو!“

”آپ شاید ناراض ہو گئی ہیں۔ حالانکہ میرا مقصد آپ کو ناراض کرنا یا غصہ دلانا نہیں تھا۔“  
 ”اوہ.....“ دوسری طرف پھر وہی ڈھیٹ تھا۔ مسفرہ جھنجھلا گئی۔

”آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“ بالآخر اس نے پوچھ ہی ڈالا۔

”تم سے تنہی کو مانگ لوں میں سو سوالوں سے ہی ایک سوال اچھا ہے ایسے رویٹنگ جواب پہ مسفرہ بھونچکا رہ گئی۔

”اس بکواس شعر کا مقصد؟“ اپنے کشیدہ ہوتے اعصاب کو بمشکل قابو میں رکھتے ہوئے اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔  
 ”کول ڈاؤن مسفرہ!“ وہ اتنے ہی اطمینان سے بولا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آپ اچھے خاصے عقلمند انسان ہیں۔ یقیناً پڑھے لکھے بھی ہوں گے۔ کم از کم آپ ایسے لوگوں کو تو ایسے کسی کو تنگ نہیں کرنا چاہیے اور وہ بھی اپنی بہن کی دوست کو۔“ اس نے نفسانی حربہ استعمال کیا۔  
 عشق نے ہمیں جکھا کر دیا غالب ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اس نے جواباً مسکراتے ہوئے شعر پڑھا۔  
 ”گلتا ہے لڑکیوں کو شعر سنانے کی آپ کو خوب بریکٹس ہے۔“ اس کا ٹھنڈا ہوتا دماغ ایک مرتبہ پھر محو ہو گیا۔  
 ”صرف آپ کو۔“ وہ فوراً سے بولا تھا۔  
 ”لیکن مجھے اس قسم کا کوئی ذوق و شوق نہیں لہذا برائے مہربانی آپ کو دوبارہ یہاں فون کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اپنے ایلٹے ہوئے اشتعال کو اس نے بمشکل لفظوں میں ڈھالا تھا۔  
 ورنہ جی تو چاہ رہا تھا اس چیپ قسم کے لڑکے کا سر پھاڑ دے۔

”گلتا ہے بندہ خاصا ڈھیٹ ہے۔“ اس کے ریور رکھتے ہی بیل پھر سے بج اٹھی۔  
 ”آپ کو شرافت کی زبان سمجھ میں نہیں آتی۔“ اس نے چھوٹے ہی کہا۔

”کون.....؟ مسفرہ.....!“ زریون کی آواز سن کے وہ سچ سچ بوکھلا گئی۔

”یہ کسے کہہ رہی تھی تم اور میں گھنٹے سے فون ملا رہا ہوں۔ مکمل انجی کی ٹون آرہی تھی۔ کس کا فون آیا تھا۔“

”یونہی تھا کوئی رائگ نمبر پہ..... بدتمیز سا.....“ وہ گڑبڑا کے پولی۔ حالانکہ وہ خود اس معاملے میں شریک نہیں تھی۔ لیکن اس کا خیال تھا وہ کسی دوسرے کو نہ ہی پریشان کرے تو بہتر ہے فرحت سے کہہ کر خود ہی اس معاملے کو کلوز کر دے اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی یہاں اس کا امیج خراب ہو۔

”رائگ نمبر پر اگر اتنی طویل گفتگو کی جائے تو وہ ”رائگ نمبر“ نہیں رہتا۔“ اس کا انداز خاصا جتنا ہوا تھا۔ مسفرہ ہنسنے لگی۔

”میں نے یہ پوچھنے کے لئے فون کیا تھا۔ عون گھر آیا ہے؟“  
 ”جی!“

”اسے کہو مجھے فون کرے۔ آدھے گھنٹے بعد ایک ضروری کام ہے۔“  
 ”جی!“ وہ پھر یہی کہہ سکی۔  
 ”اوہ کے اللہ حافظ۔“ اس نے ریور رکھتے ہی گہری سانس خارج کی اور عون کو زریون کا پیغام دینے کے لئے اندر بڑھ گئی۔

”میری تو سنتا کب ہے یہ لڑکا! ہزار مرتبہ کہا ہے کچھ اپنا بھی خیال رکھا کر، لیکن یہ تو ایک کان سے سن کے دوسرے سے اڑا دیتا ہے۔“ زریون کو بخار کیا ہوا تھا۔ زائدہ بیگم نے گھر سر پہ اٹھالیا تھا اور سب سے زیادہ شامت بھی بیچارے زریون کی ہی آئی ہوئی تھی۔

”مامی جان! بیماری تو کسی انسان کو بھی لگ سکتی ہے۔ اس میں کوئی اپنا قصور تھوڑی ہوتا ہے۔“ مسفرہ نے انہیں ٹھنڈا کرنا چاہا۔  
 ”وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! مگر انسان کو اپنے طور پہ تو بچاؤ کرنا چاہیے۔ یہ زریون شروع ہی ایسا ہے لا پرواہ، بے نیاز۔“ ان کی بات پہ مسفرہ کے ہونٹوں پہ مسکراہ دوڑ گئی۔ زریون کے بھی نقاہت زدہ لب متکرائے تھے۔

”بچپن کی عادتیں اتنی جلدی تھوڑی تھوڑی چھوٹی ہیں۔“ مسفرہ کی بات یہ وہ لاجواب ہو کے اسے دیکھنے لگیں۔

”اچھا تم ذرا اس کا بخار چیک کرو۔ میں صوما سے بہتی ہوں کوئی ہلکی پھلکی چیز بنا دے زریون کے لئے۔ پھر اس نے دوائی بھی کھانی ہے۔“ گھنٹوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے وہ کھڑی گئیں۔

دو دن بعد زریون کا بخار ہلکا ہوا تھا۔ تو سب نے سکھ کا سانس لیا تھا ورنہ زریون بیگم تو گھر بھر کو نچا کے رکھ دیا تھا۔ ان دو دنوں میں مسفرہ نے بھی اس کا بہت خیال رکھا تھا۔

وہ زریون کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مسفرہ نے لپک کے اخبار اس کے ہاتھ سے پکڑا زریون نے چونک کے اسے دیکھا۔

”ابھی آپ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئے لہذا ابھی پڑھنے وغیرہ سے اجتناب کریں۔“ دھونس بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس کے بیڈ کے قریب رہی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

”میں تو صرف سرسری سے نظر دوڑا رہا تھا تین دن سے اخبار نہیں پڑھا تھا تو.....“  
 ”تو بد قسمی ہونے کا اندیشہ تھا۔“ مسفرہ نے اس کی بات درمیان سے اچک لی تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

”اب ایسا بھی میں اخباری کیڑا نہیں ہوں کہ بغیر اخبار پڑھے مجھے کھانا ہی ہضم نہ ہو۔“ وہ محفوظ ہو کے بولا تھا۔

”دیے اگر آپ اخبار سننا چاہیں تو میں بھی آپ کو خبریں پڑھ سکتے سنا سکتی ہوں۔ آپس کی بات ہے مجھے نیوز کا سٹر بننے کا بہت شوق ہے۔“  
 ”اوہ..... شیور۔“ اس کے کہنے پہ اس نے اخبار کے صفحات پلٹ کے دیکھے۔

زریون پوری طرح متوجہ ہو کے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر لیمن گرین کلر کے کھلتے ہوئے برعزل لباس میں وہ خود بھی بہت تروتازہ لگ رہی تھی۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی ہم رنگ جھمکیاں تھیں۔ جو اس کے چہرے کی جنبش پہ بل رہی تھیں۔ یہی ٹاپک جو وہ کچھ دیر پہلے پورے اٹھاپک سے پڑھ رہا تھا۔ اب اس کی توجہ صفر بھی نہیں تھی۔ وہ پورے گیان و دھیان سے اسے دیکھا رہا تھا جو اس سے بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

”مسفرہ! ایک بات پوچھوں تم سے۔“  
 ”اگر اس آرٹیکل کے متعلق پوچھنا چاہتے



ہیں تو.....

”نہیں۔“ اس نے فوراً اس کی بات کاٹی۔  
”تو پھر پوچھیں۔“ اخبار رول کر کے اس نے ٹھوڑی کے نیچے رکھ کے چہرہ اس کے اوپر نکایا۔

”جھوٹ مت بولتا۔“

”میں نے کبھی جان بوجھ کر سچ کو چھپایا نہیں۔ ویسے اس تلقین کا شکر یہ۔“ اس کے انداز وہ متعجب ہو رہی تھی۔ لیکن ظاہر نہیں کیا۔

”اتفاق کیسا لڑکا ہے؟ میرا مطلب ہے آفاق تمہیں کیسا لگتا ہے؟“ سوال واقعی جواب طلب تھا۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ اپنے اور آفاق کے درمیان ایک نازک رشتہ ہونے کے باوجود اس نے بھی اس طور آفاق عالم کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ شاید اس کی وجہ آفاق کا ریزرو رویہ تھا۔

”اچھا لڑکا ہے۔“ اسے خود سمجھ نہیں آئی تھی وہ آفاق کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کر کے۔

”جہتیں پسند ہے؟“ ایک اور مشکل سوال۔  
”نا پسند بھی نہیں ہے۔ وہ اچھا ہے ابجو کیڈ ہے۔ انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹر ز کر رکھا ہے۔ ویل آف میلی سے تعلق رکھتا ہے۔ ویل منیرڈ ہے، اسارٹ ہے، وہ کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا ہے۔“ وہ بولنے لگی تو بولتی ہی چلی گئی۔

”کیا کسی بھی لڑکی“ کی فہرست میں تمہارا نام ہے؟“ یہ سوال مشکل ہی نہیں پیچیدہ بھی تھا اور اس وقت جو جواب اسے خود سے موصول ہوا تھا۔ اس پر وہ خود بھی دنگ رہ گئی تھی۔

”آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں زریون بھائی!“ وہ خائف سی ہو کے بولی۔

”سچ ایوں سے آزاد ہونے میں اتنا وقت تو نہیں لیتا مسفرہ! ہاں تم بتانا نہ چاہو تو اور بات

ہے۔“ وہ مبہم انداز میں بولا۔

”میں آئیڈیلزم پہ یقین نہیں رکھتی۔“ رول شدہ اخبار کو ایک سائیڈ پر رکھتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔

”اور اگر آپ کا آئیڈیل آپ کے سامنے آ جائے تو.....“ بات ادھوری چھوڑ کے وہ اس کی پشت کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک دم ہی مڑی اور دوزانو ہو کے اس کے بیڈ کے قریب بیٹھ گئی۔

”تو ایسے میں انسان کو کیا کرنا چاہیے زریون بھائی! جب کہ وہ پہلے سے مقید بھی ہو۔“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اس نے پوچھا تھا اور اس کا ایک سوال ہی زریون یوسف کے تمام سوالوں پر بھاری تھی۔ وہ گنگ سا اسے دیکھ گیا۔

”کوئی جواب ہے اس کا تو مجھے بتائیے گا ضرور زریون بھائی!“ وہ ابھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔

”تو مسفرہ بھی.....“ وہ ابھی تک حق دق سا بھی سوچے جا رہا تھا۔

زریون کا پھولا ہوا منہ دیکھ کے مسفرہ کو ہنسی آ گئی۔ اس کا اور زریون بیگم کا صبح اچھا خاصا معرکہ ہوا تھا۔ وہ بضد تھا آج وہ آفس جائے گا لیکن زریون بیگم کا خیال تھا۔ ابھی کل ہی تو وہ بخار سے اٹھا ہے لہذا کم از کم آج کے دن تو وہ آفس نہیں جا سکتا۔

”زریون بھائی! چائے پیس گے آپ؟“ بابا چوان سب کی فرمائش پہ چائے بنانے کے لئے ابھی بھی اس سے بھی پوچھ لیا۔

”نہیں۔“ اس نے نکا سا جواب دیا۔

اس بار وہ روٹھا تو چپ بیٹھے رہے ہم بھی اک بار منا لیتے تو ہر روز خفا ہوتا عون جو اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ کہنی اس

کے کندھے پر نکا کے شعر پڑھا۔

”خبردار! جو تم نے کوئی فضول قسم کا شعر سنایا“ وہ اس کی کہنی پر سے جھٹکتے ہوئے بھنا کے اٹھا۔ مسفرہ کو بڑے زوروں کی ہنسی آئی۔

”اس بیچارے کا کیا قصور ہے زریون بھائی!“ اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے زریون کو دیکھا۔

”ہاں سارا قصور تو میرا ہے جس نے اسے دک لیا تھا صبح۔ اس سے تو اچھا ہوتا میں تمہیں ہانے ہی دیتی۔“ زریون بیگم ابھی اندر داخل ہوئی تھیں۔ مسفرہ کی بات سن کے بولیں۔

”میں نے ایسا کب کہا ہے امی جان!“ ان کے جارحانہ انداز کو محسوس کرتے ہوئے زریون رابول اٹھا۔

”تو بیٹا! میں بھی تمہارا ہی بھلا چاہتی ہوں۔ اتنی بگھائی دوڑنی زندگی میں کچھ وقت بننے لئے ہی نکالنا چاہیے۔ اگلا دن تو انسان کو ویسے ہی مصروف کر دیتا ہے۔“ وہ بھی فوراً ہی دم بڑھ گئیں۔

”نانی امی! بس اب آپ اس لنڈورے کی ہادی کر دیں۔ بہت آزاد رہ لیا اس نے اب اسے لگام ڈالیں۔“ زریون کی نظریں بے ساختہ مسفرہ کی طرف اٹھی تھیں اسے کچھ مسفرہ نے دیکھا تھا۔ نظریں کے تصادم پر مسفرہ نے نفی ہو کے آنکھیں جھکا لیں۔

”اے عون! تمہاری نظر میں ہے کوئی لڑکی.....“ زریون بیگم نے بڑے راز دارانہ لہجے میں دریافت کیا۔

”تو یہی نانی امی! پروہ میرے ساتھ ادا سوٹ کرے گی۔ اگر آپ ایک نظر ان کو لیں تو یہی بات آگے بڑھے گی۔“ عون نے تو مانے کی حد ہی کر دی تھی۔

”چل بے شرم! تجھے ہر وقت اپنی پڑی رہتی

ہے۔“ انہوں نے ایک زوردار دھپ اسے رسید کرتے ہو کہا۔

”قسم سے بڑا بھاری ہاتھ ہے نانی امی! لگتا ہے ڈی جی سینٹ سے بنا ہے۔“ عون بڑے درد بھرے لہجے میں کراہا۔ ان سب کے چہروں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”نانی امی! چائے دوں آپ کو۔“ ماہا چائے بنا کے لے آئی تھی۔

”نہیں بچو! تم پیو۔“ وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

”لے لیں، میں آپ کے لئے بھی بنالاتی تھی۔“ چائے کا کپ زریون کی طرف بڑھاتے ہوئے ماہا جاتے ہوئے انداز میں مسکرائی تھی۔

زریون نے شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کپ تھام لیا اور پھر سب کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس وقت گزرنے کا بالکل بھی احساس نہیں ہوا۔

صوما کی کسی بات پر مسفرہ نے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔ زریون کی نظروں نے بے ساختہ اس کے چہرے کو چھوا تھا اور اس کے متوجہ ہونے سے پہلے ہی پلٹ آئی تھیں۔ صوما غالباً اپنے بچپن کا کوئی دلچسپ قصہ سن رہی تھی۔ جب ہی مسفرہ کے بار بار قہقہے ابل رہے تھے۔ زریون نے کن اکھوں سے کئی بار اس کا ہنسا ہوا چہرہ دیکھا تھا لیکن یہ چہرہ کس اور کی امانت تھا۔ خود کو باور کرواتے ہوئے وہ ہر بار نظریں جھکا لیتا تھا۔

بے گل لے گل رہتے ہو پر محفل کے آداب کے ساتھ آنکھ چرا کے دیکھ بھی لینے بھولے بھی بن جاتے ہو عون کے حسب حال شعر پڑھنے پر وہ جزبہ ہو کے چائے کے سیپ لینے لگا۔ عون کا چھت چھاڑ قہقہہ گونج اٹھا۔

”تمہارے قہقہے کیوں ابل رہے ہیں۔“ زریون نے تیوری چڑھا کے اسے گھورا۔



اسکے سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔  
ٹیلیفون نہ تھا۔

”مسفر! تمہارا فون ہے۔“ فون عون نے ہی ریسو کیا تھا۔

”ہیلو مس مسفر! محمود! مزاج بخیریت ہیں؟“ دوسری طرف سے آتی آواز پہ وہ واقعتاً نہیں حقیقتاً اچھل پڑی تھی۔

اپنی طرف سے وہ تو یہ خیال کر رہی تھی کہ اس کی اس دن کی عزت افزائی کے بعد اس نے خود ہی اس کا پیچھا پھوڑ دیا ہے۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی ہی نکلی تھی۔

”آپ.....“ حیرت و غصے کی زیادتی اتنی تھی کہ اس نے بولا ہی نہیں گیا۔

”پچھلے دنوں کچھ مصروف تھا۔ اس لئے آپ سے رابطہ نہ ہو سکا۔ ویسے شکوہ کرنا آپ کا حق بنتا ہے۔“ وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے ان کے درمیان بڑے گہرے مراسم ہوں۔

”بھڑا میں گیا شکوہ، شکایت۔“ وہ تلملا ہی تو اٹھی۔ پھر اپنے ارد گرد کا خیال کر کے ذرا دھیمی آواز میں غرائی۔

”آپ نے یہاں فون کیوں کیا ہے حالانکہ میں نے آپ کو منع کہا تھا لیکن لگتا ہے آپ کی عقل شریف میں یہ چھوٹی سی بات نہیں آئی۔“

”دھیرج..... ڈیر! دھیرج..... اتنا غصہ آپ پہ اتنا سوٹ نہیں کرتا۔ لیکن میرا ذاتی خیال ہے غصے میں بھی آپ بہت پیاری لگتی ہوں گی۔“ وہ بڑے لگاؤ بھرے انداز میں بولا تھا۔

”لیکن مجھے آپ کے منہ سے اپنی تعریف سننے کا کوئی شوق نہیں۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فون پر ہی اسے دو، چار کرارے سے پھپھرید کر دے۔

”اب میں آپ سے آخری دفعہ کہہ رہی ہوں، آپ آئندہ یہاں کوئی فون نہیں کریں گے

ورنہ.....“

”نہ..... نہ فون مت رکھیے گا مس مسفر۔“ ورنہ میں تب تک مسلسل فون کرتا رہوں گا۔ جب تک آپ میری بات نہیں سنیں گی۔“ اس کی ڈھٹائی پہ وہ کھول کے رہ گئی۔ البتہ اب کی دفعہ اس نے ریسو کر ڈیل پہ نہیں رکھا۔ اس ڈھٹ کا کوئی اعتبار نہیں تھا اور وہ اپنا تماشہ لگوانا نہیں چاہتی تھی۔

”کیسے..... کیا کہنا ہے۔“ طوعاً کرہاً اس نے اجازت دی۔

”میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں آج بھی یونیورسٹی گیا تھا۔ لیکن آپ نہیں آئیں اور مجھے نامراد لوٹنا پڑا۔ اگر آپ کو میری دوستی قبول ہے تو پھر میں صبح فرحت کو ڈراپ کرنے آؤں گا۔ آپ گیٹ سے مجھے ہاتھ ہلا دیجئے گا۔ میں سمجھ جاؤں گا۔“ خلاف توقع اس نے بڑے آرام سے اس کی ساری بات سنی تھی اور یہی بات دوسری طرف اسفند کو کھٹک رہی تھی۔

”اور اگر میں ایسا نہ چاہوں تو پھر.....“

”تو پھر ٹیلیفون تو ہے ہی ناں، ایک نہ ایک دن آپ کو بانٹنا پڑے گا۔“ اس کی مبینی فطرت پہ مسفر نے بمشکل تمام خود پہ جبر کیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں سوچ کر بتاؤں گی۔“ ابھی تو اس نے جان چھڑائی چاہی تھی۔

دوسری طرف وہ نجانے خوشی میں آ کے کیا کیا بکواس کیے جا رہا تھا۔ مسفر نے بیزار ہو کے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

ریسو رکھ کے وہ ذرا سا پلٹی تو زریون کو اپنی طرف متوجہ پایا۔ ایک دم ہی اس کا رنگ فق ہوا تھا۔ زریون نے بغور اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ ابھی چند لمحے قبل وہ کس سے گفتگو کر رہی تھی۔ وہ کچھ عجیب طرح اندازہ نہیں کر پایا تھا کیونکہ

اس کی آواز خاصی دھیمی تھی۔ البتہ چہرے کے اچڑھاؤ سے وہ غصے میں لگ رہی تھی۔

وہ ایک دم ہی آگے بڑھی اور تیز تیز چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ صوما اور ماہا سے آوازیں دیتی رہ گئیں۔ جب کہ وہ ”میں“ کی آئی ہوں“ کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔ زریون کے ماتھے پہ نفط کی لہریں پھیل رہی تھیں۔

”نہیں۔“ اس کے کمرے کا دروازہ ناک والا تھا۔ وہ اس وقت ہسٹری کے متعلق کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مصروف سے انداز میں کہہ کر دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں چائے لے کر آئی تھی آپ کے لئے۔“ مسفر ہ کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے کتاب پر سے ہٹائی۔ چائے اسے پکڑاتے ہوئے اس نے گویا اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔

زریون نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب اس سے رکھی اور کپ اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

”تھک رہی۔“ مسفر نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تھا۔ کچھ سوچ کے چپ رہ گئی۔ کافی سوچ بچار کے بعد زریون کے پاس آئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا مسئلہ حل کر دے گا۔ بلکہ اسے یقین ملے گا اور ایسا کیوں تھا وہ شاید خود بھی نہیں لگتی یا پھر جانے تو جتنے انجان بن رہی تھی۔ انمیاں چنچلتے ہوئے وہ کافی تذبذب کا شکار تھی۔

”بیٹھ جاؤ مسفر!“ اسے ایک ہی جگہ اسٹل زریون نے کہا تو اس سے کچھ فاصلے پر ٹھیک صوفے پہ بیٹھ گئی۔

”کوئی مسئلہ ہے کچھ کہنا چاہتی ہو۔“ اس کے اتار چڑھاؤ سے اس نے اندازہ

لگایا تھا کہ وہ کوئی بات کہنے آئی ہے لیکن اب کہہ نہیں رہی۔ اب بھی منہ سے کچھ کہنے کی بجائے اس نے صرف آہستگی سے سر ہلایا تھا۔

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے تم جو کہنا چاہو بلا جھجک کہہ سکتی ہو۔“ زریون نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

”وہ..... میں.....“ وہ رک رک کے بمشکل دو الفاظ ہی ادا کر سکی تھی۔

”مسفر! ادھر دیکھو میری طرف۔“ اس نے سر اٹھا کے اس کی جانب دیکھا وہ سنجیدہ نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ زریون نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔

”تم مجھ پر مکمل اعتماد کر سکتی ہو۔ تم یقیناً مجھے ایک اچھا دوست اور راز داں پاؤ گی۔“ اس کے گھبرے ہوئے مضبوط لہجے پر مسفر کے دل کو بھی جیسے قرار سا آ گیا تھا۔ اس کا اضطراب خاصاً کم ہوا تھا۔

”آپ پر اعتماد کیا ہے تو ہی اپنا مسئلہ آپ کے پاس لے کر آئی ہوں۔“

”تو کہو ناں، میں اسے سولو کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اسے خود بھی بھس ہو رہا تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

”انچولی میری دوست ہے فرحت یہیں یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتی ہے۔ اس کا بھائی ہے اسفند..... وہ دھیرے لہجے میں ساری بات بتاتی چلی گئی۔ اسفند کا ایسے ڈراپ کرنا..... بار بار فون کرنا..... دوستی کی پیشکش.....“

”تم نے پہلے دن سے ہی مجھے کیوں نہیں آگاہ کیا۔“ اگرچہ وہ اسفند کی گفتگو کے اکثر بکواس الفاظ حذف کر گئی تھی۔ اس کے باوجود زریون کا اشتعال آمیز انداز اسے خائف کر گیا تھا۔



”مجھے علم نہیں تھا وہ باری بارفون کر کے مجھے تک کرے گا۔ میں نے سوچا تھا اپنی بے عزتی کروانے کے بعد وہ دوبارہ یہ حرکت نہیں کرے گا۔“ سر جھکائے ہوئے اس نے گویا اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا۔

”تم نے اپنی دوست فرحت سے اس بارے میں کوئی بات کی۔“

”میں نے ایک دفعہ کی تھی لیکن وہ مذاق میں ٹال گئی۔“

”تو تمہیں ضرورت کیا ہے ایسی فضول قسم کی دوست بنانے کا۔“ اسے اب اس پر غصہ آنے لگا۔

”تم صبح میرے ساتھ یونیورسٹی جاؤ گی۔ پھر میں دیکھ لوں گا اس الو کے ٹھٹھے کو اور ہاں آئندہ بھی تم میرے ساتھ ہی جایا کرو گی۔ میں کوشش کروں گا تمہیں واپسی پہ پک بھی کر سکوں اگر نہ بھی ہو سکا تب بھی میں عون یا ڈرائیور وغیرہ کو بھیج دیا کروں گا۔ تمہیں اب اکیلے آنے کی ضرورت نہیں اور آئندہ اس کا نوٹن آنے تو تم نے بالکل بھی اس سے بات نہیں کرنی ہے۔ بانی میں سب سنبھال لوں گا۔“ اس کی اتنی کڑی ہدایات پہ وہ اندر ہی اندر سہم گئی۔

”آپ کیا کہیں گے اس سے.....“ مسفرہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”یہ تمہارا درد سہم نہیں ہے۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔

”میں جاؤں پھر.....“ کچھ توقف کے بعد وہ کھڑی ہوئی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ سیر اثبات میں ہلا کے اس نے اسے اجازت دی تھی۔

”مسفرہ!“ وہ دروازہ کھول کے باہر نکلنے ہی والی تھی۔ جب پیچھے سے اس نے پکار لیا۔ وہ پلٹ کے اسے دیکھنے لگی۔

”ڈونٹ وری، بی ریلیکس! اور ہاں اعتماد کا شکریہ۔“ آخر میں وہ دھیرے سے مسکرایا تو مسفرہ کی بھی جان میں جان آئی۔ ورنہ اس کا جذباتی انداز دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گئی تھی۔ جواباً مسکراتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔

”عون! ارے عون! اٹھ جا یہاں ہے۔“ عون آفس سے واپسی پر لاؤنج میں ہی ٹائلس پسار کے سو گیا تھا۔ کلثوم اس کی اس عادت سے بہت چڑنی تھیں کئی بار اسے اٹھا چکی تھیں۔ لیکن وہ بھی ایسا ڈھیٹ تھا کہ کس سے مس نہ ہوا۔ وہ کچن سے باہر نکلیں تو اسے وہیں لینا دیکھ کر طیش میں آ گئیں۔

”عون!..... عون!“ اس کا بازو انہوں نے زور سے ہلایا۔

مجھے چھوڑ دے میرے حال پر تیرا کیا بھروسہ چارہ گر تیری یہ نوازش مختصر میرے درد کو ہی بڑھا نہ دے نہ یہ زندگی میری زندگی نہ یہ داستان میری داستان میں خیال وہم سے دور ہوں مجھے آج کوئی صدا نہ دے بازو آنکھوں سے ہٹا کر اس نے شعر پڑھا اور دوبارہ بازو آنکھوں پر رکھ دیا۔

”ان موئے شعروں کی جان نہیں چھوڑتا تو.....“ اس کے شعروں سے وہ جتنی خار کھائی تھیں اس سے سب یہی واقف تھے بشمول عون کے۔

”سویا رہ کم بخت! یہ نیندیں یہی تیرے بخت میں لکھ دی جائیں گی۔“ اسے دوبارہ سوتا دیکھ کر وہ غصے سے بولیں۔

نیند بھی ایک بخت ہوتا ہے کچھ ہمیں بھی چلو نصیب ہوا اس نے ”دو“ کی جگہ ”نیند“ کا صیغہ لگا کر شعر کو اپنے سبب حال پہ ڈھال لیا۔ ”بند کر دے اپنے یہ واپسیت شعر اور اٹھو یہاں

سے، سونا ہے تو اپنے کمرے میں جا کر سوؤ۔ یہیں پر کے پڑ جاتے وہ۔“ انہیں طیش ہی تو آ گیا۔ ”یہاں سونے میں کیا قباحت ہے اماں حضور!“ بالآخر اس نے اٹھنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

”ارے! یہ وقت ہے تیرے سونے کا۔ ابھی شام بھی پوری طرح نہیں ڈھکی اور تجھے نیند آ رہی ہے۔ ایک تو آفس سے اتنی جلدی بھاگ آتے ہو اوپر سے یوں یہاں آ کے پڑ جاتے ہو جیسے پتھر ڈھوکے آ رہے ہو۔ گھر میں سو چھوٹے نوٹے کام ہوتے ہیں۔ لیکن تمہیں اپنے آرام سے فرصت ملے تو ہی کچھ اور دیکھو۔“ ان کے ہاتھ بھی ایک موقع آ گیا تھا۔ شکایات کا دفتر کھول کے بیٹھ لیں۔

”آہ۔“ وہ اٹھ کے بیٹھ گیا اور لمبی سی جمائی لے لے۔

شکایتیں نہ گلہ کرے کوئی ایسا شخص بھی ہوا کرے ”نہ تو تجھے کس سے گلے شکوے ہیں۔“ ان نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

”کو برا کہہ دوں، غیر تو نہیں ایسا آپ ہی سے شکوہ ہے آپ ہی کے بارے میں“ ”تیرے تو منہ لگنا ہی فضول ہے عون! خدا ہے تھے۔“ انہیں پہلے تو سمجھ نہ آئی۔ جب آئی اسے دو ہنر مار کے کھڑی ہو گئیں۔ وہ بیچارہ گراہ کر رہ گیا۔

”اف اللہ! تمہیں اتنے برمل شعر کیسے یاد ہو جاتے ہیں عون!“ کلثوم کے جاتے ہی مسفرہ کا صدمہ کس بس پڑی۔

”بچپن سے لے کر اب تک ایک ہی تو کام ہے۔“ جواب صوما کی طرف سے آیا تھا طنز کا ہوا۔

یہاں پر کوئی بازوق انسان ہے ہی ”عون نے بے حد مایوسی سے سردا میں

بلائیں ہلاتے ہوئے کہا۔

”اہل ذوق کی کوئی قدر ہی نہیں۔“ ”کس کو قدر نہیں اہل ذوق کی۔“ زریون اسی وقت اندر داخل ہوا تھا۔

”مسفرہ! پانی تو پلاؤ۔“ ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے وہ ریلیکس انداز میں بیٹھ گیا۔ مسفرہ فوراً اٹھ کے کچن میں آ گئی۔

”یہ لیں۔“ اس نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ زریون صوما کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا۔ اس کا دھیان بھی اسی طرف تھا۔ بے دھیانی میں گلاس اس کے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے اس کی انگلیاں مسفرہ کی انگلیوں کو بچ کر نکلیں۔ گلاس مسفرہ کے ہاتھ سے لرز اٹھا اور کچھ پانی زریون پہ چھلک گیا۔ اگر زریون فوراً گلاس نہ تھام لیتا تو یقیناً سارا پانی ہی اس کے اوپر الٹ جاتا۔

مسفرہ کچھ خجل سی ہو کے ماہا کے برابر آ کے بیٹھ گئی۔

”تم بتاؤ مسفرہ!“ صوما اب اس کے سر ہو گئی۔

”کیا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے صوما کو دیکھا۔

”کیا شاعری کو سمجھنے کے لئے محبت کا ہوتا ضروری ہے؟“

”میرا خیال ہے نہیں۔“ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ اس کا جواب عون کو کافی مایوس کر گیا تھا۔

”بلکہ ہر احساس کو سمجھنے کے لئے محبت کا ہوتا ضروری ہے۔ محبت کے بغیر تو انسان خود کو نہیں سمجھ سکتا۔“ اس کا لہجہ جملہ عون کو خوش کر گیا تھا۔ صوما اور ماہا نے بھی متاثر کن انداز سے دیکھا تھا۔

”میں جانتا تھا اپنی مسفرہ بڑی ذہین ہے۔“ عون خاصا اترا ہوا تھا۔



”لیکن عون! کیا محبت کرنا بہت ضروری ہے۔“ صومانی کچھ الجھ کے عون کو دیکھا۔

”ہاں۔“

”کیا تم نے بھی محبت کی ہے؟“

”بالکل، بھلا محبت کے بغیر.....“

”ادنیہ، اپنی شاعری والی محبت۔“ وہ اس کی بات کاٹ کے بولی۔

”وہ کیا ہے کہ ابھی ہر لڑکی میں مجھے اپنی شاعری نظر آتی ہے تو مجھے فی الحال سمجھ نہیں آرہی کہ محبت کس سے کروں۔“ عون نے سر کھجاتے ہوئے اپنی مشکل بتائی۔ مسفرہ کے ہونٹوں پہ مسکان بکھر گئی۔

”تم تو ایویں ہو، اچھا زریون بھائی! کبھی آپ نے کسی سے محبت کی ہے۔ شاعری والی محبت۔“ عون کو چھوڑ کے صومانی زریون کی طرف متوجہ ہوں۔ ماہائی دیکھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ البتہ مسفرہ کا رواں رواں کان بنا ہوا تھا۔ اس کی بھری مسکراہٹ ایک دم ہی سمٹ گئی تھی۔

وہ کیا جواب دینے والا وہ ہرگز نہیں جانتی تھی۔

”ہاں کی ہے۔“ اس کا لہجہ واقعی گہرائی لئے ہوئے تھا پھر پتہ نہیں اسے ہی محسوس ہوا تھا۔ ”تو پھر بتائیں کیا واقعی محبت پہلی نظر میں ہو جاتی ہے۔“ اب کی دفعہ ماہانی بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”محبت تو شاید واقعی پہلی نظر میں ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ اس کا احساس بہت دیر سے ہوتا ہے۔“ مسفرہ سن ہو کے رہ گئی اس جواب پہ۔

”پھر انسان کو ایسے وقت میں کیا کرنا چاہیے۔“ وہ دونوں تو پورا اندر دبو لینے پہ تل گئیں۔ ”پتہ نہیں جب کروں گا دیکھ لینا۔“ وہ بظاہر

بات کو چٹکیوں میں اڑا گیا تھا۔ لیکن مسفرہ اس حقیقت جان گئی تھی۔

”آج ڈر کا موڈ نہیں ہے۔“ ارجم اور نبی بھی آگئے تھے۔ ان کی دخل اندازی پر وہ دونوں خاصی بد مزہ ہوئی تھیں۔

”مجھے بھوک لگی ہے۔“ انہیں وہیں جماد کر منیب چلایا۔

”لگا دیتی ہوں کھانا، کوئی قحط نہیں ٹوٹا ہو یہ۔“ صومانی اسے گھورا۔

”جلدی لگا دیں ناں۔“ ارجم بھی اس تائید میں بولا۔

پھر اس سے پہلے کہ اس کے مزید حوا اکٹھے ہوتے۔ وہ تینوں اٹھ ہی پڑیں کہ عافہ اسی میں تھی۔ لہذا اس موضوع کو انہوں پھر کسی وقت کے لئے اٹھالیا۔

-----  
”آپ کو کیسے پتہ چلا کہ مجھے بھوک لگی ہے۔“ کارزادوای ٹیبل پہ بیٹھتے ہوئے مسفرہ زریون سے پوچھا۔

اس دن سے زریون خود اسے ڈرا کرنے جاتا تھا اور واپسی پر اکثر اوقات عون آتا تھا۔ زریون زیادہ تر مصروف ہی رہتا تھا لیکن آج نہ صرف وہ اسے خود لینے آیا تھا اسے لچ کے لئے قریبی ریستورنٹ میں بھی آیا تھا۔

مسفرہ نہیں جانتی تھی زریون نے اسفند کیا کہا تھا۔ البتہ اب اس کے مسلسل فون آنا ہو گئے تھے۔ ابتداء میں ایک دو بار فون آیا لیکن مسفرہ نے بات نہیں کی تھی۔

”صبح ہی تم بغیر ناشتے کے آگئی تھی اور علم ہے آج تم نے بیورٹی میں بھی کچھ نہیں کیا گا اور دیے کبھی تمہارے چہرے پہ بھوک اثرات خاصے واضح ہیں۔“ اس کی اپنی وضاحت

پہ مسفرہ مسکرا دی۔  
”اس کا مطلب ہے Face Reeding میں بھی ماہر ہیں۔“

”سب کے چہرے پڑھنے نہیں آتے لیس ان لوگوں کے چہرے پڑھ سکتا ہوں۔ جن کے چہرے کھلی کتاب کی مانند ہوتے ہیں۔ صاف، بے ریا جیسے کہ تمہارے ایسے لوگوں کے چہرے بڑی آسانی سے پڑھے جاسکتے ہیں۔“ مینو کارڈ پہ نظریں دوڑاتے ہوئے وہ بڑے آرام سے کہہ رہا تھا۔

”تمہاری تعریف کی ہے۔“ تھینکس ہی بول دو۔ ”کنجوس لڑکی!“ ویٹر کو آرڈر نوٹ کرانے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”بھئی اتنی تعریف تو میرا حق ہے۔“ اتراتے ہوئے اس نے اسے چڑایا۔

”چلو اسی بہانے سہی، کوئی حق تو میرے حصے میں آیا۔“ وہ محفوظ ہو کے بولا۔ تو مسفرہ جربز ہو گئی۔

شکر تھا اسی وقت ویٹر آگیا تو وہ خاموش ہو گیا۔

کھانے کے دوران وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا تھا۔ مسفرہ کو اس کا ساتھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو اس کا شدت سے جی چاہا تھا کاش اس کا کسی آفاق سے کوئی واسطہ نہ ہوتا۔ وہ کسی آفاق نامی شخص کو جانتی تک نہ ہوتی۔

لیکن وہ ایسا صرف خواب میں ہی سوچ سکتی تھی۔ کیونکہ حقیقت اس کے سامنے تھی۔

”ایک بات پوچھوں آپ سے زریون ماہائی!“ ارد گرد بیٹھے لوگوں پہ ایک نظر دوڑانے کے بعد اس نے زریون کو دیکھا۔ جو بڑی رغبت سے نوک کی مدد سے فرائیش کھا رہا تھا۔

”پوچھو اس میں اجازت لینے والی کون سی

بات ہے۔“ وہ اسی مصروف سے انداز میں بولا۔ ”سچ بتائیں گے؟“ وہ اسے نگاہوں سے جانچتے ہوئے بولی۔

”جھوٹ مت بول لینے گا۔“

”جھوٹ تو میں عام حالات میں بھی نہیں بولتا۔ ویسے یقیناً کا شکریہ۔“ اس کے الفاظ اس وقت کیا جتا رہے تھے وہ سمجھ چکی تھی۔ تاہم وہ اپنا سوال کرنے سے رکی نہیں تھی۔

”میں کسی لڑکی ہوں؟ میرا مطلب ہے میرے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟“ نجائے کس جذبے کے تحت مسفرہ نے اسی کے سوال کو دہرائے تھے۔

”اچھی لڑکی ہو۔“ اس وقت زریون کو بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ ان سوالوں کا کیا جواب دے۔ مسفرہ ابھی بھی جواب طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اچھی ہوا بیکو کیڈ ہو، بیانی میں ماسٹر زکر رہی ہو..... ویل آف ٹیلی سے تعلق رکھتی ہو..... ویل منیرڈ ہو..... گڈ لنگ ہو..... کسی بھی شخص کا آئیڈیل ہو سکتی ہو۔“ وہ بہت ٹھہر ٹھہر کے گویا ہوا تھا۔

اب کی دفعہ حیران ہونے کی باری مسفرہ کی تھی وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”نہیں۔“ اسے دوبارہ بولنے کے لئے منہ کھولتا دیکھ کر وہ ایک دم ہاتھ اٹھا کے اسے روک گیا تھا۔

”اب کچھ مت پوچھنا میں تو پہلے ہی تمہارے ایک سوال کا مقصد ہوں۔“

مسفرہ کی آنکھیں بھرا گئیں۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔ لیکن اس کا ایک ایک نقش چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا۔

”کیا وہ شخص آپ نہیں ہو سکتے؟“ اور زریون بھلا کیسے نہیں اس کا چہرہ پڑھ سکتا



تھا۔ اگر کچھ دیر پہلے وہ اسے پڑھنے کا دعویٰ کر رہا تھا تو وہ کچھ ایسا غلط تو نہیں تھا۔ لیکن وہ تو خود اس معاملے میں بے بس تھا۔ اسے قدسیہ پھپھو کے وہ الفاظ اچھی طرح یاد تھے۔ جو انہوں نے بڑے مان سے اسے کہے تھے۔

”ہماری مسافر تو شروع سے ہی اپنے آفاق کی امانت ہے۔ اس کی چچی تو ابھی شادی کا اصرار کر رہی تھیں، لیکن مسافر کی ضد ہے اسے آگے بڑھنا ہے پھر آفاق کو بھی کوئی اعتراض نہیں، لیکن بیٹا! آج کل ماحول کچھ ایسا ہے کہ بیٹی کو باہر بھیجتے ہوئے ڈر لگتا ہے لیکن تم پر مجھے پورا مان اور بھروسہ ہے۔ یہ مسافر بہت سادی ہے۔ ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرنا، تاکہ میں معاشرے میں سر اٹھا کر کہہ سکوں۔ میری بچی کی تربیت میں کوئی جھول نہیں ہے۔“

لہذا بہتر ہی تھا وہ دل کو سمجھا لیتا۔

”اور کیا اس کے سمجھانے سے دل سمجھ جائے گا اگر ”دل“ بھی سمجھانے سے سمجھنے لگ جائے تو پھر اور کیا چاہے تھا اسے۔“ اپنی ہی سوچ پر وہ دگر رفتہ ہو گیا۔

”چلیں۔“ ٹولڈر بیک کا اسٹریپ کندھے پہ جماتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔ زریون بھی سوچوں سے یلغار سے نکل آیا۔

”میں گاڑی میں بیٹھ رہی ہوں آپ آ جائیں۔“ وہ تیز قدم اٹھانی باہر نکل گئی۔ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بل بے کر کے وہ باہر نکل آیا۔ جہاں پارکنگ میں اس کی کھڑی گاڑی کھڑی تھی۔

-----

سوچتا ہوں بہت معصوم و سادہ ہے وہ میں ابھی اس کو شہنائے محبت نہ کروں روح کو اس کی اسیر غم الفت نہ کروں اس کو روانہ نہ کروں، وقف مصیبت نہ کروں

سوچتا ہوں ابھی رنج سے آزاد ہے وہ واقف درد نہیں، خوگر آلام نہیں سحر عشق میں اس کی اثر شام نہیں زندگی اس کے لئے زہر بھر جام نہیں سوچتا ہوں کہ محبت ہے جوانی کی خزاں اس نے دیکھا نہیں، دنیا میں بہاروں میں سوا نگہت دنور سے لبریز نظاروں کے سوا سبزہ زاروں کے سوا اور ستاروں کے سوا

مغرب کی نماز پڑھ کے وہ ٹیرس پر آ گئی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اب صرف ہلکی ہلکی نارنجی شعاعیں ہی باقی تھیں۔ بلکہ ان کا رنگ بھی مدہم مدہم پڑتے پڑتے غائب ہو رہا تھا۔ ”کیا ابھی محبت بھی یونہی دھیمے دھیمے سے ختم ہو سکتی ہے جیسے سورج اتنا بلند اور روشن ہوتا ہے کہ اس کی طرف دیکھنے سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں پھر آہستہ آہستہ غروب ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس کی زرد روشنی بھی اپنا اثر کھو دیتی ہے اور اندھیرا ہر چیز پر غلبہ پالیتا ہے۔ بھلا محبت کبھی اندھیروں میں مدہم ہو سکتی ہے؟ ابھی اپنا اثر کھو سکتی ہے؟ شاید بھی نہیں۔“

اب اکا دکا ستارے آسمان پہ ٹھنٹا شروع ہو چکے تھے۔ وہ چلتی ہوئی زریون کے کمرے میں آ گئی۔ وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ مسافر نے ہاتھ بڑھا کر سوچ آن کیا پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ چند لمحوں میں کھڑی اس کی خوشبو کو محسوس کر رہی تھی پھر بیرونی دروازہ کھول کے بالکلونی میں آ گئی۔

نیچے سے زریون بیگم کے بولنے کی آواز اوپر تک آرہی تھی، لیکن مفہوم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ غالباً ابھی نماز سے فارغ ہوئی تھیں۔ کیونکہ مغرب کی نماز کے بعد وہ نوافل بھی ادا کرتی تھیں۔

اس نے سر اٹھا کے پھر آسمان کی طرف

دیکھا جہاں اب ستارے نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کا دل اتنا اداس کیوں ہو رہا تھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آرہی تھی۔ شاید اس دن کے زریون کے رویے کی وجہ سے اس دن کے بعد اس کی زریون سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور اس نے خود بھی اسے بلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ نظریں چرائے ہوئے تھے۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ عقب سے آواز آئی تو وہ اچھل کے مڑی۔ سامنے زریون کھڑا تھا وہ کب آ رہا تھا اسے کچھ خبر نہ ہوئی تھی اور نہ ہی اسے اس کی گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی۔ شاید وہ اپنی سوچوں میں اس قدر محو تھی کہ ارد گرد سے ٹیکر بے نیاز ہو گئی تھی۔

اسے سامنے کھڑا دیکھ کر مسافر نے اپنا رخ دوبارہ موڑ لیا۔ زریون بھی گھوم کے اس کے سامنے آ گیا۔ ریلنگ سے ٹیک لگائے وہ اسی پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتی زریون کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”چاند اور روشنی کا کتنا گہرا ساتھ لگتا ہے ناں۔“ چپچپاہٹ سے رائے پیش کی گئی یا اس سے تقدیق مانگی گئی تھی۔ جواب دینے کی بجائے اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔

”مسافر!“ زریون نے ایک دم ہی اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ”ہاتھ چھوڑیں میرا۔“ اس کی آنکھیں ڈوٹاواہ ہی بھر آئیں۔

”میں جانتا ہوں مسافر! تم جس حال سے گزار رہی ہو۔ یقین کرو میں نے خود کو بہت روکا۔ بہت سمجھایا تھا۔ بہت دلائل بھی دیئے تھے۔ لیکن سب بے سود، ہر دلیل، ہر تاویل بے کار ہی گئی۔ مجھے خود غم نہیں ہوا کب دل نے تمہاری چاہ

کی کب تمہیں پانے کی تمنا کی اور ہر احساس، ہر جذبہ صرف ایک طلب بن کے رہ گیا۔“ وہ آسمان کی وسعتوں میں نچلنے کیا کھوج رہا تھا۔ مسافر نے پلکیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ حالانکہ وہ یہ سب جان تو بہت پہلے سے گئی تھی۔ اس کے باوجود آج زریون کے منہ سے سن کر اسے نئے سرے سے دکھ ہونے لگا تھا۔ وہ خود بھی تو اتنی ہی مجبور تھی جتنا کہ وہ تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ۔

”آپ کو ایسا نہیں سوچنا چاہیے زریون بھائی! اس رشتے کو مضبوط نہ بنائیں۔ یہ ناپائیدار ہی رہے تو بہتر ہے۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھی۔ حالانکہ اس کی اپنی حالت بھی ایسی کہ اسے زیادہ سمجھنے کی ضرورت بھی یہ نسبت اس کے۔

”اس رشتے کو مضبوط بنانا نہیں پڑتا مسافر! یہ تو خود بخود ہی مضبوط ہو جاتا ہے۔“

”پھر بھی ہم حقیقت ہے آکھ تو نہیں چرا سکتے۔“ مسافر نے اپنا ہاتھ آہستگی سے چھڑایا۔

”جانتا ہوں میں، معلوم ہے مجھے، ہم کسی فلم یا ڈرامے کے کردار نہیں ہیں۔ جو ہر روایت، ہر بندھن کو توڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم کسی افسانے کے کردار بھی نہیں کہ فلم کی فٹنیش سی اپنی مرضی کے مطابق پتو چھین بدل لیں۔ ہم زندہ جاگتے انسان ہیں اور بہت سی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، لیکن ہم مجبور بھی تو ہیں۔ ہم تو اپنی ہی ساری خواہشات بھی پوری نہیں کر سکتے۔“ آسمان کی کھوج ترک کر کے وہ اب اسے دیکھ رہا تھا۔

”اس کا کوئی حل نہیں سکتا مسافر!“ اس نے بڑی آس سے پوچھا تھا۔

مسافر نے دہل کے اسے دیکھا۔ یہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا اس کے بارے میں۔



”آپ..... آپ شادی کر لیں زریون بھائی!“ فوری طور پر یہی حل اس کی سمجھ میں آیا تھا وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنس دیا۔

”کس سے.....“

”کسی بھی اچھی لڑکی سے۔“

”اچھی تو تم بھی ہو مسفرہ!“

اور مسفرہ کو نجانے کیا ہوا تھا۔ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی اس کے اچانک رونے پر زریون بوکھلا گیا۔

”مسفرہ! مسفرہ!“ اسے سمجھ نہیں آ رہی کس طرح اسے خاموش کروائے۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں میں بہت سخت دل ہوں پتھر دل ہوں۔ میں پاگل ہو جاؤں گی زریون بھائی!“ وہ اسی زاویے میں نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ زریون مزید گھبرا گیا۔

”اٹھو یہاں سے اندر چلو۔“ اس نے بازو سے پکڑ کے اسے اٹھایا اور اندر لاکر بیڈ پر بٹھا دیا۔ روم فرنیچ سے پانی کی بوتل نکال کے۔ پانی گلاس میں انڈیلا۔

”یہ لو پانی پی لو۔“ اس نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ پیاس نہ ہونے کے باوجود وہ سارا گلاس خالی کر گئی۔

اس کا بھیگا چہرہ زریون کو ندامت میں مبتلا کر گیا۔ مسفرہ نے جلد ہی خود پہ کنٹرول کر لیا تھا۔ اس کے آنسو اب ٹھم چکے تھے۔ وہ قالین پہ نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی۔

”میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا مسفرہ! اور نہ ہی کبھی ایسا سوچا بھی تھا۔ بہت سی لڑکیوں نے میری زندگی میں آنے کی کوشش کی، لیکن میں نے کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ میں نے کبھی سرے سے سوچا ہی نہیں تھا کہ زریون یوسف کبھی کسی سے محبت ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کبھی شادی بھی کر لوں گا۔ جب اس کی ضرورت محسوس

ہوئی لیکن..... لیکن ضروری نہیں ایک کامیاب بزنس مین کی ہر پلاننگ ہی کامیاب ہو جائے۔ کبھی کبھی انسان بری طرح ناکام ہو جاتا ہے بالکل میری طرح۔“ اس سے کچھ فاصلے پہ بیٹھے ہوئے افسردہ لہجے میں گویا اپنا ہی مذاق اڑا رہا تھا۔

مسفرہ نے تڑپ کے اسے دیکھا صحیح کہا تھا اس نے محبت کا ادراک ان دونوں کو ہی بہت غلط مروج پہ ہوا تھا۔

زریون نے بہت نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما تھا۔

”زندگی ہمیشہ ویسے رنگ اختیار نہیں کرتی جیسے ہم چاہتے ہیں، بلکہ جو رنگ اسے اچھے لگیں۔ وہ وہی اپنا لیتی ہے۔ ایک کامیاب انسان وہی ہے جو ہر طرح کے حالات سے کپروماز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تم سمجھ رہی ہوتاں۔“ رک کر اس نے تصدیق طلب نظروں سے اسے دیکھا۔ تو مسفرہ نے آہستگی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”تھینک یو۔“ اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے آہستگی سے چھڑایا اور کھڑی ہو گئی۔

”ہمیں واقعی اپنے اپنے حالات سے کپروماز کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ زریون نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں ہلکی ہلکی نمی تیر رہی تھی۔

مسفرہ جانتی تھی یہ سفر لا حاصل ہے۔ اس کے باوجود دل اسی منزل کی طرف ہمکتا تھا۔ اسی راستے پہ گامزن تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی اگر اس نے ایک مرتبہ بھی امی، پاپا یا محران سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا اور آفاق سے شادی کا ستارہ نکلا کیا تو وہ اس کی بات رد بھی نہیں کریں گے۔ لیکن اس کے خلاف ان سب کے دنوں میں چمیل آ جاتا اسے شاید وہ ساری عمر بھی اسے دھولی

رہتی تو مٹا نہیں پاتی۔ اپنے باپ کا سروہ اپنے چھوٹے چچا کے سامنے ہی کیونکر جھکا دیکھ سکتی تھی۔ وہ اتنی بھی خود غرض نہیں تھی ایک اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے وہ کس کس دل کے ارمانوں کو روندتی۔ کتنے مان کو توڑی، کیا وہ ساری زندگی اپنے گھر والوں سے کٹ کر رہ سکتی تھی ہرگز نہیں۔ زریون اس مسئلہ کا حل پوچھتا تھا تو حل تو صرف یہی تھا کہ وہ دونوں دل کی حالت سے نظر چرا کے موجودہ حالت سے کپروماز کر لیتے۔

وہ سوچ چکی تھی اسے کیا کرنا چاہیے اس سے پہلے کہ دل کی لگا میں مزید ڈھیلی پڑ جائیں اور واپسی کا راستہ ہی مسدود ہو جاتا اس ایک بہتر فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔ دل میں ایک صحیح ارادہ کر کے وہ مضبوط قدم اٹھانی باہر نکل گئی۔

-----

”بھلا یہ عید ہی تم ہمارے ساتھ کر لیتی تو کیا ہو جاتا، اتنا مزہ آتا تھا۔“ اسے پیکنگ کرتا دیکھ کر صوما اداسی سے بولی۔

”تو اور کیا بقرہ عید پہ تو ویسے بھی بہت مزہ آتا ہے ہم قربانی کے بکرے کو عید سے ایک دن پہلے خوب سجاتے سنوارتے ہیں۔ مہندی لگاتے ہیں۔ رک جاؤ ناں!“ ماہانے پہلے اسے لالچ دی پر منت پہ اتر آئی۔

”زندگی رہی تو پھر سہی۔ اب گھر میں سب اداس ہو رہے ہیں۔ میں عید الفطر پہ ہی گئی تھی ویسے بھی امی اب بیمار ہیں وہ بتانی تو نہیں ہیں لیکن مجھے تو علم ہے ناں وہ میرے بغیر اداس ہو گئی ہیں۔“ بیگ کی زپ کرنے کے بعد وہ اپنا بیگ بیگ میں چند ایک ضروری چیزیں رکھنے لگی۔

”تم عید الفطر پہ یہ وعدہ کر کے گئی تھی کہ تم عید الاضحیٰ ہمارے ساتھ کرو گی۔“ صومانے اسے نجائے نئی مرتبہ سے یہ بات کہہ چکی تھی۔

”کہاناں پھر کبھی سہی۔“ بڑی دقتوں سے وہ مسکرانے کے قابل ہوئی تھی۔

دروازہ زوردار آواز سے کھلا تھا۔ مسفرہ نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا عون اندر داخل ہوا تھا اس کی پیکنگ دیکھ کے ہنسنے لگا۔

”اوہ..... مجھے تو لگ رہا ہے تم اپنا سب سامان سمیٹ کے جا رہی ہو۔ کیا دوبارہ آنے کے ارادے نہیں ہیں۔“ آنکھیں سیٹھرتے ہوئے اس نے بغور مسفرہ کو دیکھا وہ بری طرح گڑبڑا گئی۔

”ارے تم دونوں یہاں کھڑی ہو۔ تائی امی تمہیں بلا رہی ہیں۔ ان کے بھانجے کی خدمت کرو۔“ ان دونوں کو چپکا کر کہہ کر وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”تو تم بھاگ رہی ہو یہاں سے..... مسائل سے فرار مسائل کا حل تو نہیں، وہ کیا کہتے ہیں شتر مرغ کی طرح ریت میں گردن گھسالیں۔ یا پھر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینا۔“ وہ استہزائیہ ہنسا۔ مسفرہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

وہ کیا کہہ رہا تھا۔

”میں پڑھائی سے نہیں بھاگ رہی، اگلے سمسٹر تک آ جاؤں گی۔“ وہ اس کے معنی خیز جملوں سے یہی مطلب اخذ کر پاتی تھی۔

”کون سا سمسٹر..... مسفرہ بی بی! تم یہاں واپس تو نہیں آؤ گی۔ میں نے خبر تو نہیں۔ محبت سے بھاگ رہی ہو؟ جتنا بھاگو گی یہ اتنا ہی دامن تھامے گی۔“ اسے ایک جھٹکا لگا تھا۔ کیا عون واقعی باخبر تھا؟ لیکن اسے کیسے خبر ہوئی؟ وہ گنگ رہ گئی۔ ہم نے تو عشق خود سے بھی چھپایا ہے یہ دیواریں بول پڑیں یا لوگوں کا اندازہ ہے وہ جن نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا مسفرہ کو بری طرح شرمندہ کر گئیں۔ وہ سر جھکا کے انگلیاں چٹانے لگی۔



”مسفر! تم ایک بار کوشش.....“

”کچھ مت کہنا عون! کچھ مت کہنا، میں نے خود کو بڑی مشکلوں سے سمجھایا ہے اور کیسے سمجھایا ہے یہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ کوئی بات نہ چھیڑنا۔ یہ پہلے ہی لبریز ہے اسے چھلکے میں درپنیں لگے گی۔ اپنی سسکیاں دباتے ہوئے وہ بمشکل کہہ پائی تھی۔“

”زریوں سے مل آئی ہو تم؟“ وہ کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا تھا۔ مسفرہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”جاؤ مل آؤ، اس بھول میں مت رہنا۔ وہ تمہیں سی آف کرنے جائے گا۔ وہ تمہیں خدا حافظ کہنے گیٹ تک نہیں آئے گا۔“ کہنے تو وہ اسے بہت کچھ آیا تھا۔ لیکن اس کی حالت نے اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ بات وہ اسے کہہ ہی گیا تھا۔

”جاؤ حمران ابھی جلدی مچا دے گا۔“ وہ دوبارہ بولا۔

مسفرہ کچھ دیر کھڑی رہی غالباً کچھ سوچ رہی تھی وہ، پھر یکدم پلٹی اور دروازہ کھول کے باہر کی طرف بڑھ گئی۔

وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی تو وہ بیڈ پہ دراز کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ یا شاید مطالعہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں جا رہی ہوں۔“ کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کے وہ اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”جانتا ہوں۔“ کتاب سے نظریں ہٹا کر زریوں نے اسے دیکھا۔

”تو یہ حل نکالا ہے تم نے۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔

”آپ اگر میری جگہ پہ ہوتے تو آپ کیا کرتے؟“

”میں تو اپنی جگہ پہ رہ کے کچھ نہیں کر سکا۔“

تمہاری جگہ پہ ہو کے کیا کر سکتا تھا۔“ اسے ایجاب کرنے کی بجائے وہ خود لا جواب ہو گئی تھی۔

”اپنی اسٹڈی کو کیوں ادھورا چھوڑ رہی ہو۔ اسے تو کلیٹ کر لو۔ کوئی شوق تو پورا ہو جائے۔“ کتاب بند کر کے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

کیا لطف انجمن کا جب دل ہی تجھ گیا ہو وہ افسردہ سی ہنسی ہنس دی۔

”ابھی ایک سال تو ہم مزید اکٹھے رہ سکتے ہیں مسفرہ!“ وہ بستر سے اٹھ کے اس کے مقابل آن کے کھڑا ہو گیا۔

”نہیں۔“ مسفرہ نے تیزی سے سرنفی میں ہلایا تھا۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں الٹا نقصان ہی ہو گا۔“

”میں تمہیں بہت مس کروں گا مسفرہ، بہت زیادہ۔“ اس کا لمبیہ لہجہ مسفرہ کو کمزور کرنے لگا تھا۔ وہ فوراً رخ موڑ گئی۔

”آئم سوری۔“ اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پہ جماتے ہوئے اس نے اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

”تم بہت اچھی ہو مسفرہ! خدا کرے تمہیں زندگی کی ہر خوشی ملے۔ تم یکسر بھول جاؤ۔ زریوں یوسف نامی بھی کوئی لڑکا تھا۔“

مسفرہ کی آنکھیں ڈیڈ باگئیں۔ اس کی سب سے بڑی خوشی تو چھن گئی تھی اب زندگی نے اسے اور کیا دینا تھا

”تم..... تم بہت یاد آؤ گی مجھے۔“ اس کی نگاہوں کی پیش اور لہجے کی حدت وہ برداشت نہیں کر پائی تھی۔ گرم گرم سیال اس کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پہ بہنے لگا۔

زریوں نے بہت نرمی سے اس کے آنسو صاف کیئے۔ اگرچہ اس کی اپنی آنکھ نم ہو رہی

تھیں۔ آپ کی زندگی آپ سے بچھڑ رہی ہو تو آپ سکون سے رہ سکتے ہیں۔ وہ بھی کیسے رو سکتا تھا۔ لیکن برداشت تو کرنا تھا ناں۔ آخر مرد جو ٹھہرا۔

اس نے جتنا ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔ اتنا ہی بے اختیار ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی حرکت اس سے سرزد ہوئی۔ مسفرہ نے اس کے دونوں ہاتھ کندھوں سے ہٹا دیئے۔ اس کی اتنی قربت ہی اسے بوکھلا کے رکھ گئی تھی۔ اوپر اس کی بے اختیار ہوئی نگاہیں اور اس کا اپنا فرار حاصل کرتا دل۔

”اللہ حافظ!“ وہ کہہ کر رکی نہیں تھی فوراً باہر کھل گئی۔

”مسفرہ بیٹا! آ جاؤ حمران بلا رہا ہے۔“ یوسف ماموں اسے آوازیں دے رہے تھے۔ وہ چہرہ صاف کر کے لاؤنج میں آگئی۔ اسے دیکھتے ہی حمران کھڑا ہو گیا تھا۔

”مسفرہ! جلدی آ جانا عید کے فوراً بعد۔“ وہ سب اسے تاکید کرنی لگی تھیں۔ اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے جا رہی ہے کیونکہ پھر ان سب کا ری ایکشن کیا ہوتا تھا۔ وہ جان سکتی تھی۔

”جلدی جاؤں گی تو جلدی آؤں گی ناں۔“ وہ مصنوعی مسکراہٹ چہرے پہ جا کے بولی۔ عون نے درزیدہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

میں جانتا ہوں جدائیوں کا عذاب کیا ہے میں نے روح کو پھڑتے جسم سے دیکھا ہے شعر اس کے لبوں پہ پھڑ پھڑا کے دم توڑ گیا تھا۔ لیکن وہ جوتائی امی اور امی کے غصے کی پرواہ کے بغیر ہر وقت شعر پڑھتا رہتا تھا۔ آج خاموش رہ گیا تھا۔ اس کے اپنے دل میں دکھ کی کیفیت بھری ہوئی تھی۔

”حمران بھائی! جلدی چھوڑ جائیے گا

اسے۔“ ان کے ملتے ملتے بھی ان سب کی تلقین کی تھی۔ اتنی محبتوں کو بھلانا کہاں آسان تھا اس کے لئے، ایک الوداعی نظر سب پہ ڈال کے وہ گاڑی میں بیٹھ گی۔ عون کی پرسوں نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

ہمیں یہ روز و شب کا سلسلہ اچھا نہیں لگتا کسی سے بات کرنا ہو، کوئی بھی زخم بھرتا ہو کبھی بے حال ہو کر کوائے جاناں سے گزرتا ہو تمہاری یاد میں رہنا اور خود سے مکرنا ہو کسی حرف لیلی سے دل کا زخم بھرتا ہو محبت کی دعا ہو نٹوں پہ رکھ کے مسکراتا ہو درختوں پہ تمہارا نام لکھ کے بھول جاتا ہو کسی بے خواب شب میں چشم ویراں کو سلاتا ہو تمہاری خوشبوؤں سے خیمہ جاں کو سجاتا ہو یا پھر سکوت شام غم میں گیت گاتا ہو لونی بے وجہ کیفیت میں اشکوں کو بہاتا ہو مگر

کسی جذبے کا بھی چہرہ ہمیں سچا نہیں لگتا کہ اب تو روز و شب کا سلسلہ اچھا نہیں لگتا اس کا دل کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ جب سے آئی تھی بس جب چپ سی تھی۔ جب سب کے درمیان بیٹھتی تو پھر زبردستی مسکراتی اور تہمتے بھی لگاتی۔

”اس عید پہ بکرا لیا جائے یا گائے، تمہارا کیا خیال ہے مسفرہ!“ عید میں چند دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ وہ گلدان میں پھول لگا رہی تھی۔ صبح ہی اس نے سارے گھر کی ازسرنو صفائی دھلائی کی تھی۔ سارے گلدانوں سے پھول نکال کے دھوئے تھے۔ اب انہیں گلدانوں میں نئے سرے سے جوڑ رہی تھی۔ جب حمران نے اندر داخل ہوتے ہوئے اس سے رائے مانگی۔

”جو مرضی لے آؤ۔ مجھے تو دونوں ہی اچھے



لگتے ہیں۔“ سچے ہوئے گلدان کا ایک نظر جائزہ لینے کے بعد اسے سائیڈ پر رکھا اور دوسرا گلدان اٹھالیا۔

”تمہارے سرسالی تو اس دفعہ گائے شریف لے رہے ہیں۔ بھی ان کا خاندان بھی تو اتنا لمبا چوڑا ہے۔ ارے سرالیوں سے یاد آیا۔ پچھلے دنوں آفاق آفس کے سلسلے میں ملتان گیا تھا۔ امی نے اسے خصوصی تاکید کی تھی کہ تمہاری خیر خبر لیتا آئے۔ آیا تھا آفاق وہاں؟“ بات کرتے کرتے اچانک اسے یاد آیا تو پوچھنے لگا۔

”نہیں، وہاں تو نہیں آئے۔“ خود کو مصروف ظاہر کرتے ہوئے وہ سرسری انداز میں بولی۔

”اور اچھا ہی ہوا کہ نہیں آئے۔“ شاید اس کے ذہن میں نہ رہا ہو۔ میرا خیال ہے اسے تمہارے آنے کی بھی خبر نہیں ہے۔ ورنہ وہ ایک چکر تو ضرور لگاتا۔ میں اسے فون کر کے بتاتا ہوں۔“ وہ ایک دم ہی اٹھا۔

”حمران بھائی! رکیں رہنے دیں۔ یہ اطلاع دینا کوئی ایسی ضروری تو نہیں کہ خصوصی طور پر بتایا جائے۔ ویسے بھی چچی جان نے اب تک بتا دیا ہو گا۔“ وہ بے اختیار ہی اسے ٹوک گئی۔ حمران ٹھٹھک کے مڑا۔

”امی نظر نہیں آرہیں۔ کہیں گئی ہیں کیا۔“ وہ بات بدلنے کی غرض سے پوچھنے لگی۔

”ہاں! یہ برابر والوں کی آئی ناعمہ ہیں ناں، ان کی بہو ان کی بھٹی ہے اور امی حضور کو انہوں نے صلہ صفائی کے لئے بلایا ہے۔ آخر کو عید جو آنے والی ہے۔“ وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ سفر نہ نے جزبہ ہو کے گلدان پیچھے کیا۔ پھر آگے بڑھ کے اسے کارنس پر رکھنے لگی۔ حمران کی خاموش نگاہیں اسے الجھن میں مبتلا کر رہی تھیں۔

”مفرہ! وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔

مفرہ اس کی جانب پلٹی۔

”پتہ نہیں کیوں مجھے اے لگتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ کوئی پرائم ہے؟“ حمران کا انداز بہت دوستانہ تھا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ شاید ایک دم ماحول بدلا ہے اس وجہ سے آپ کو ایسا محسوس ہوا ہے۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا وہ اور کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

”شاید ایسا ہی ہو، لیکن پھر بھی اگر پریشانی ہو تو تم اپنے بھائی پر مکمل اعتماد کر سکتی ہو۔“ وہ چلتا ہوا اس کے قریب آ کے ٹھہر گیا۔ مفرہ نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں بلایا۔ وہ اس کا کندھا تپتہ پتاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ضبط کے باوجود آنسو اس کی گالوں پر لڑھک گئے۔

”بیٹیوں کے دم سے ہی تو گھر آباد ہوتے ہیں۔ تم چلی گئی تھی تو پھر مجھے کاٹ کھانے کو دیوتا ہے۔“ صحن میں ہلکی ہلکی دھوپ پھیل رہی تھی۔ وہ امی کی گود میں سر رکھے لیٹے تھی۔

”اے مفرہ! تجھے میں کتنی بار کہہ چکی ہوں۔ حمران کے ساتھ جا کر اپنے لئے شاپنگ کر لو پہلے تو ہر عید پر تمہاری تیاری ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ اب کیا محسوس ہو کے بیٹھی رہتی ہو۔ بس گھر کو چکانے کا جنون سوار ہو گیا ہے تم پر۔“ وہ اس کے بال انگلیوں سے سہلاتے ہوئے بولیں۔

”چلی جاؤں گی امی! ابھی تو دل نہیں چاہ رہا۔“ وہ صاف انہیں ٹال رہی تھی۔

”کب چلی جاؤ گی، عید تو سر پہ آئی کھڑی

ہے۔“

”آپ کے سر پہ کھڑی ہوگی میرے سر پہ تو نہیں کھڑی۔“ اس نے آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”عادتیں نہیں بدلی تمہاری۔“ انہوں نے اسے ہلکی سی چپت رسید کی۔ (میں خود جو بدل گئی ہوں)۔

”تمہاری چچی تو اب بیمار سی رہتی ہیں۔ کہہ رہی تھیں جیسے ہی مفرہ کی پڑھائی ختم ہوتی تو فوراً ہی پیار پیچھے آ جاتیں گی۔“ وہ اسے گویا آگاہ کر رہی تھیں۔

”تو پھر آپ نے کیا کہا؟“ وہ اضطرابی انداز میں اٹھ کے بیٹھ گئی۔

”میں نے کیا کہا تھا۔ ان کی امانت ہے، لیکن میں نے اتنا ضرور کہا تھا۔ میری بیٹی بڑی فرمانبردار ہے اگر میں کہوں گی تو وہ اپنی خواہش پھوڑ دے گی لیکن میری بات نہیں ٹالے گی اور کہیں باٹنی میں ماسٹر کرنے کا کتنا شوق ہے یہ تو میں جانتی ہوں۔ ایک تو خواب ہے میری بیٹی کا۔

وہ بھی نہ پورا ہونے دوں۔“ اس کا ماتھا چومتے ہوئے ان کے لہجے میں جو خرد و دان تھا۔ وہ مفرہ کی آنکھیں بھگو گیا۔

”انتا اعتبار ہے مجھ پر۔۔۔۔۔“ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس پوچھا۔

”اس سے بھی زیادہ۔“ وہ مسکرائیں۔

”اور میں آپ کا یہ اعتبار ہمیشہ قائم رکھوں گی انشا اللہ۔“ ان کا ہاتھ دباتے ہوئے وہ امی اور اندر چلی گئی۔

”کیسی ہو مفرہ؟“ عقب سے آئی آواز ہے۔ ایک دم مڑی اور پتھر کے رہ گئی۔ اس کے سینے

مسکرائی۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیاز اور چھری اس نے سیلپ پر رکھ دی۔ وہ چکن میں لٹچ بنانے کی غرض سے آئی تھی۔

”تمہارے سامنے ہوں۔“

”اندر چل کے بیٹھیں آپ یہاں تو۔۔۔۔۔“

”نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں ابھی سیدھا آفس سے آ رہا ہوں۔“ وہ وہیں ڈائننگ ٹیبل کی کرسی دھکیل کے بیٹھ گیا۔

مفرہ نے فریج کھول کے اس کا جائزہ لیا۔

”میرے لئے کوئی تکلف مت کرنا میں زیادہ وقت کے لئے نہیں آیا۔ بس یہیں سے گزر رہا تھا سو چاقم سے ملتا جاؤں۔“ انچوکی میں کل شام کو ہی لوٹا تھا ملتان سے۔“ مفرہ ایک لمحے کے لئے رکی۔ پھر خود کو نارل کرتے ہوئے سو فٹ ڈرنک کا ٹین پیک اس کے سامنے رکھتے ہوئے وہ خود بھی اس کے سامنے والی کرسی دھکیل کے بیٹھ گئی۔

”کیسا رہا آپ کا ٹور؟“

”بہت اچھا اور بہت یادگار۔“ ٹین پیک کھولتے ہوئے وہ رک رک کے بولا تھا۔

”میں تمہارے ماموؤں کی طرف بھی گیا تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تم واپس آ چکی ہو۔ میں آفس سے واپس پہ گیا تھا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ تم یہاں نہیں ہو تو شاید میں نہ ہی جاتا۔ ایک دم ہی تمہارا ارادہ بن گیا واپس آنے کا۔“ اس کا لہجہ کچھ جانچتا ہوا تھا۔

”بس ویسے ہی، گھر والوں کے بغیر اداس ہو گئی تھی۔“ اس کا انداز کافی محتاط تھا۔

”واپس کب تک جانا ہے۔ تمہارے سمسٹر شروع ہونے والے ہیں۔“ مفرہ کا ہاتھ اضطرابی انداز میں ہل رہا تھا۔ وہ ہر ایک کو کیا جواب دیتی کسی طرح مطمئن کرتی۔

”کیوں آپ کو میں یہاں ابھی نہیں لگ



رہی۔“ اس نے بات مذاق میں اڑائی۔  
 ”ویسے زریون اچھا لڑکا ہے۔“ اس کا جملہ اتنا اچانک تھا کہ مسفرہ کا سانس ایک لمحے کے لئے رگ سا گیا۔

”وہ سب ہی بہت اچھے ہیں۔“ وہ بمشکل تھوک نکل کے بولی۔

”مجھے عوں نے بتایا تھا کہ.....“ بات ادھوری چھوڑ کے آفاق نے اس کے چہرے کے تاثرات جاننے کی کوشش کی تھی۔

وہ پتہ نہیں کیا کہنے جا رہا تھا۔ مسفرہ کے چہرے پر پسینے کے قطرے تیزی سے پھیلنے لگے۔ دونوں ہاتھ آپس میں بٹھنے ہونے کے باوجود وہ ان گیلیاں محسوس کر سکتی تھی۔

”تم نہ صرف ایک اچھی لڑکی ہو بلکہ بہت اچھی لڑکی ہو۔ میری لائف میں بہت سی لڑکیوں نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی، لیکن میں نے خود کو ہمیشہ ہی مقید محسوس کیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں تم سے کوئی دھواں دار قسم کی محبت کرتا تھا۔ لیکن تم ہمیشہ میری پسند ضرور رہی ہو۔ ابراہائے لائف پارٹنر مجھے تم میں بھی کوئی کمی یا عیب محسوس نہیں ہوا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ تم میری ماں کی پسند تھیں۔“ وہ سب باتیں اسے کیوں بتا رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی۔ لیکن اس کی اتنی جی چوڑی تمہید نے اس کے آپس پاس خطرے کی گھنٹی بجائی تھی۔

”لیکن زندگی کبھی کبھی بہت بڑا مذاق کرتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے بہت بھیا تک قسم کے مذاق کرتی ہے۔“ مین پیک کی اوپری طرح پر انگلی پھیرتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

”آپ..... آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔“ بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ اس کے استفسار پہ آفاق نے اپنی گہری نگاہیں اس پر جمادیں۔  
 ”یہ سمجھ تو مجھے نہیں آ رہی کیا کہوں۔“ وہ

اب اضطرابی انداز میں ٹیبل پہ انگلیاں بجا رہا تھا۔

”ہمیں کبھی کبھار یوں محسوس ہوتا ہے ہم بہت خود مختار ہیں۔ اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہیں۔ لیکن جب کسی فیصلے کا حق ہمیں تھا یا جاتا ہے تب ہمیں معلوم ہوتا ہے ہم کتنے ”آزاد“ اور ”خود مختار“ ہیں۔ ہم اپنی خواہش کو تو قربان کر سکتے ہیں لیکن جن لوگوں کی توقعات ہم سے وابستہ ہیں ہم انہیں کس طرح مایوس کر سکتے ہیں مسفرہ!“ اور مسفرہ کو اپنے کان سائیں سائیں کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

”تو کیا..... آفاق حقیقت جان گیا تھا؟ کیا عوں نے اسے کوئی ایسی بات بتائی تھی؟ یا اس نے خود سے کوئی اندازہ قائم کر لیا تھا؟“ ان سوالوں کے جواب وہی دے سکتا تھا جو اس وقت اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

”مسفرہ! تم اسے لے کے یہیں بیٹھ گئی ہو۔ اٹھو آفاق بیٹا! اندر چل کے بیٹھو۔“ قدسیہ اسی وقت اندر داخل ہوئی تھیں۔ ان دونوں کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا تھا۔

”نہیں تائی امی! میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ادھر سے گزر ہوا تو سوچا مسفرہ سے ملتا جاؤں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ مسفرہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ لیکن اس کا خالی دماغ اس وقت بھانپ نہیں بھانپ کر رہا تھا۔

”پر بیٹا! اب تو کھانے کا نام ہو رہا ہے۔ کھانا کھا کے جانا۔“ آخر کو وہ ان کا ہونے والا اکلوتا داماد تھا اور جیتجا بھی تھا۔ رشتہ دہرا ہو جائے تو اہمیت خود بخود بڑھ جاتی ہے۔

”کھانا پھر کبھی نہی تائی امی! مجھے ایک ضروری کام ہے اسی وجہ سے تو آفس سے جلد اٹھ آیا تھا۔“ اس نے رست واپس پہ ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا پھر حمران آئے گا تو میرا اسلام کہیے گا اللہ حافظ۔“ اس نے ایک نظر صدم بکھڑی مسفرہ پہ ڈالی اور قدم باہر کی طرف بڑھا دیئے۔ قدسیہ اسے چھوڑنے کی ٹیک گئی تھیں۔ جب کہ وہ ابھی تک وہیں حق دق سی کھڑی تھی۔

اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو  
 اشک رواں کی پھر ہے اور ہم ہیں دوستو  
 یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد  
 تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو  
 لائی ہے اب اڑانے گئے موسموں کی پاس  
 برکھا کی رت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو  
 شام الم ڈھلی تو چلی درد کی ہوا  
 راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو  
 آنکھوں میں اڑ رہی ہے مٹی محفلوں کی دھول  
 عبرت سرائے دیر ہے اور ہم ہیں دوستو

”تم اس وقت بالکل ایک اداس پورٹریٹ لگ رہے ہو۔ جی چاہ رہا ہے تمہیں اٹھانے کے دیوار سے چمکا دوں اوہ سوری لڑکا دوں۔“ عوں نے پاس بیٹھے زریوں سے کہا تو افسردہ ہونے کے باوجود مسکراہٹ اس کے لبوں پہ چھب دکھلا ہی گئی تھی۔

”تمہیں ہمیشہ اوٹ چٹانگ باتیں ہی کیوں سوجھتی ہیں۔ کبھی ڈھنگ کی بات بھی کر لیا کرو۔“ صومائے تصویر کی آنکھ سے اپنے بھائی کو دیوار پہ لٹکا ہوا دیکھا تو بھنا کے بولی۔

”مذاق چھوڑو ہمیں واقعی کوئی حل تلاش کرنا چاہیے۔“ اب کی دفعہ ماہا گویا ہوئی۔ زریون اور مسفرہ کے متعلق سب کو پتہ چل گیا تھا اور یہ کارنامہ یقیناً عوں کا تھا۔

”حل تو یہی ہو سکتا ہے کہ عین موقع پہ آفاق عالم کو اغواء کر لیا جائے اور نوری طور پر اپنے زریون کو پیش کر دیا جائے۔“ اس نے داد طلب

نظروں سے سب کی جانب دیکھا، لیکن سب کی مشترکہ کھوری پہ سر کھجانے لگا۔  
 ”تو پھر تم لوگ خود ہی سوچ لو ناں! میں کیا بتاؤں۔“

”ارے میں بتاتی ہوں تمہیں۔“ زریونہ بیگم خاصے طیش کے عالم میں اندر داخل ہوئی تھیں۔ وہ سب ہی بوکھلا کے رہ گئے۔ کیونکہ انہی یہ بات صرف بیگم جزیں تک محدود تھی۔

”وہ..... وہ تائی امی! ہم تو ویسے ہی بات کر رہے تھے۔“ عوں جلدی سے بولا۔

”ارے ماں ہوں تم سب کی اور خاص کر اس بہو قوف کی۔ کیا میں نہیں جان سکتی جب سے مسفرہ گئی ہے اس کے منہ پہ بارہ کیوں بچے رہتے ہیں اور تم سارے ہر وقت ایک جگہ گھس کے جو گھس پھس کر کے پھڑکی پکاتے رہتے ہو۔ مجھے سب علم ہے۔“ ان کی باتیں ان سب کو اپنی اپنی جگہ شرمندہ کر گئی تھیں۔

”لیکن تم فکر مت کرو۔ اگر وہ قدسیہ کی دیواری ہے تو میں اس کی بھابھی ہوں۔ بہن بھائی کا رشتہ اتنا کچا بھی نہیں ہوتا اور بہن بھائی کا رشتہ اتنا پیارا ہے کہ نہ ٹوٹ سکتا ہے اور نہ چھوٹ سکتا ہے۔“

”بالکل بجا فرمایا آپ نے تائی جان! وہ کیا کہتے ہیں کہ.....“ ہاتھ چھو میں بھی تو رشتے نہیں توڑا کرتے وقت کی شاخ سے لکھے نہیں توڑا کرتے عوں کی زبان بھلا کب بندرہ کی تھی۔

”لیکن امی جان! وہ.....“ زریون نے ہونٹ کاٹتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”میں سمجھتی ہوں تمہیں میرے بچے! اور مجھے اپنی تربیت یہ بھی فخر ہے اور قدسیہ پہ بھی ہمیں ایک کوشش تو کرنی چاہیے۔ اگر ہمارے حق میں بہتر ہوا تو اللہ تعالیٰ کبھی نہیں مایوس نہیں لوٹائیں



گے۔“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولیں۔  
”لیکن تائی امی! آپ انہیں کہیں گی  
کیا.....؟“ شامل کا سوال ہمیشہ کی طرح بونگا تھا۔  
”تمہارے سوال یہ میرا جی چاہ رہا ہے وہ  
سنانے والی دیوار پر سردے ماروں۔“ صوما نے  
جھنجھلا کر کہا۔

جا کے کھسار سے سر مارو کے آواز تو ہو  
خستہ دیواروں سے ماتھا نہیں پھوڑا کرتے  
عون کی زبان میں ایک مرتبہ پھر جھلی ہوئی تھی۔  
”تم لوگ آپس میں مت لڑنے بیٹھ جانا  
اب۔“ صوما کو منہ کھولتے دیکھ کر انہوں نے ٹوک  
دیا تو وہ منہ بنا کر رہ گئی۔

”امی جان! کیا قدسیہ پھپھو مان جائیں  
گی۔“ صوما نے اس تجسس سے دریافت کیا۔  
جیسے امی جان کو تو سارا علم ہے۔  
”امید تو ہے بیٹا!“

”لیکن وہ آفاق عالم.....؟ اس کا کیا بنے  
گا؟“ صوما کو وہ بینڈم سالڑ کا ہرگز نہیں بھولا تھا۔  
جو مسفرہ کے جانے کے بعد اس سے ملنے آیا تھا۔  
”اس کا بھی ایک حل میں نے سوچ رکھا  
ہے۔“ وہ دھمکی انداز میں مسکرائیں۔

”کیا؟“ وہ سب کو رس میں بولے۔  
”پتہ چل جائے گا۔ عون تم تیار رہنا۔  
صوما اور ماہما تم بھی۔ ہم عید والے دن نمازی پھپھو  
کی طرف جا رہے ہیں۔“ ان سب کو سکتے کے  
عالم میں وہیں چھوڑ کے وہ باہر نکل گئیں۔

”لیکن ہم لے جائیں گے۔“ حسب توقع  
عون کا سکتہ سب سے پہلے ٹوٹا تھا۔ وہ اب اٹھ کر  
ناچ رہا تھا۔

ابھی ضد نہ کر دل بے خبر!  
کہ یس ہجوم ستم گراں  
ابھی کون تجھ سے وفا کرے

ابھی کس کو فرحتیں ہیں اس قدر  
کہ سیٹھ کی تیری کرجیاں  
تیرے حق میں خود سے دعا کرے  
ابھی ضد نہ کر دل بے خبر!

کہ تہہ غبار غم جہاں

کہاں کھو گئے تیرے چارہ گر

کہ راہ حیات میں رائیگاں

کہاں سو گئے تیرے ہم سفر

ابھی غمگساروں کی چوٹ سہ

ابھی کچھ نہ سن ابھی کچھ نہ کہہ

ابھی ضد نہ کر میرے نوا

بھی یوں بھی ہو کر سرافق

تیرے دکھ کا چاند دکھ اٹھے

کوئی میں خود سے چمک اٹھے

کسی شہر زخم فروش میں

کوئی زخم خود سے خرید کر

کبھی عس خود سے کھرچ کر

کسی آئینے پر نہ دید کر

کبھی یوں بھی جشن طرب منا

کبھی اس طرح سے بھی عید کر

آج چچا جان کی پیشی کی دعوت تھی ان کے

یہاں۔ مسفرہ کا ایک پاؤں چکن میں تھا تو دوسرا

ڈرائنگ روم میں، پھر ادھر ادھر سے بھی مہمان آنا

شروع ہو گئے تھے۔ اوپر سے اسے اپنا حلیہ خاصا

آکورد لگ رہا تھا۔

عید کا سوٹ خریدنے کے لئے وہ حمران

کے ساتھ گئی تھی۔ اس وقت تو غائب دماغی کا یہ

حال تھا کہ جونا ڈریس سامنے نظر آیا اسے ہی

خرید ڈالا۔ اب تو جب اس نے عید نماز پڑھنے

کے لئے اپنا سوٹ نکالا تو چکرا کر رہ گئی۔ گولڈن

براؤن کلر کے اسٹاکس سے سوٹ۔ بڑا دیدہ

زیب کام ہوا تھا۔ حمران نے اس کی میچنگ

جیولری اور چوڑیاں بھی خرید لی تھیں۔ وہ سوچ

رہی تھی کہ کوئی اور ڈریس پہن لے کہ باہر سے  
حمران کی آوازیں آنا شروع ہو سکیں۔ وہ گاڑی  
نکال رہا تھا۔ اگر اس کی وجہ سے عید نماز لیٹ ہو  
جانی تو پھر اس کی شامت آجانی تھی۔ لہذا اس  
نے جلدی میں وہی پہن لیا۔

اور مہمانوں کو ریو کر تی وہ کافی دیر سے  
سوچ رہی تھی کہ کپڑے تبدیل کر آئے لیکن ٹائم  
ہی نہیں مل رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر اسے بہن کی کمی  
بہت محسوس ہوتی تھی۔

ڈرائنگ روم سے ایک دم ہی بہت شور بلند  
ہوا تھا۔ وہ جو آج ڈھیمی کر کے پہنچ کرنے جا رہی  
تھی۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور کر ڈرائنگ روم کی  
طرف بڑھ گئی۔ اندر سے آتی آوازوں پہ اس  
نے بے یقینی سے دروازہ کھولا تھا اور سامنے بیٹھے  
لوگوں کو دیکھ کر اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سب  
سے پہلے زینہ بیگم اٹھ کے اس سے پی تھیں اور  
باری باری بانی سب ملے تو اسے واقعی یقین آ  
گیا۔

”کیسا لگا سر پر اتر؟“ صوما نے مسکراتے

ہوئے پوچھا۔

”زبردست۔“ وہ بھی جواباً مسکرائی۔

”مسفرہ! چائے کا انتظام کرہ بیٹا!“ محمود

صاحب نے کہا تو وہ ”جی ابو جی“ کہہ کر چکن کی

طرف بڑھ گئی۔

”ڈرائنگ تو بڑی گڈ لنگ ہے تمہاری۔“

صوما اور ماہما اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھیں۔

”بس جلدی میں یہی پسند کر لیا۔“ اس نے

پانی والی کیتلی برنز پہ رکھی اور فرخ میں سے چیزیں

نکلانے لگی۔ ماہما بھی اس کی مدد میں لگ گئی۔

”تم لوگ رہنے دو، میں کر لیتی ہوں۔“

”زیادہ کیواس کی تو ایک جھانپڑ رسید کروں

گی۔“ ماہما نے مصنوعی ہنسی سے گھورا۔

”یہ کیا سارے کپ دھونے والے پڑے

ہیں۔“ صوما جو چائے بتانے کا فریضہ ادا کر رہی  
تھی۔ سنک میں پڑے کپوں کا ڈھیر دیکھ کے  
بد مزہ ہو کے بولی۔

”صبح سے مصروفیت اتنی رہی ہے کہ کپڑے  
چینج کرنے کا وقت نہیں ملا۔ برتن کیا خاک  
دھوئی۔“ مسفرہ کیابوں کو فرانی کرنے کے بعد  
پلیٹ میں رکھ رہی تھی۔

”یہ لو جلدی سے نکال لو اسی وقت۔“

آفاق نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ

میں کچھ شاپر تھے جو اس نے سیلاب بہ رکھ دیے۔

مسفرہ نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ جس نے بغیر

کہے ہی اس کی مدد کر دی تھی۔

”ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے۔“

وہ جو پلٹنے والا تھا۔ صوما کی بات پر رک گیا۔

”جی آپ کہیں۔“ وہ مہذب لہجے میں

بولا۔

”یہ ذرا ایک کپ تو دھو دیں۔“ ہاتھ میں

پکڑا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جی۔“ وہ چکرا ہی تو گیا۔

”صوما!“ مسفرہ نے تنبیہی نظروں سے

پہلے اسے گھورا پھر آفاق کی طرف متوجہ ہوئی۔

”آپ جائیں میں دھو لیتی ہوں یہ صوما تو

بس ایسے ہی.....“

”نہیں میں دھو دیتا ہوں۔“ اس نے سہولت

سے صوما کے ہاتھ سے کپ پکڑا اور دوبارہ دھو

کے اسے پکڑا دیا۔ جسے صوما نے شکر کے ساتھ

تھام لیا۔

”میں دراصل یہ چیک کرنا چاہ رہی تھی کہ

اس میں غرور اڑ رہے یا نہیں۔“ مسفرہ کی گھوری

پہ سنے کی اداکاری کرتے ہوئے اس نے کہا۔

چائے نہایت خوشگوار ماحول میں پی گئی

تھی۔

”ہمیں آپ سے ایک بات کرنی ہے اگر



اجازت ہو تو.....“ بات زرینہ بیگم نے شروع کی تھی۔ مسفرہ کی چھٹی حس نے کسی خطرے کا الارم بجایا تھا۔

”کہیں بہن جی! اجازت والی کون سی بات ہے۔“ محمود نے خوش اخلاق سے کہا۔

”آپ کی طرف سے بھی اجازت ہے؟“ وہ عالم پچا اور شاہین چچی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ”بالکل..... بالکل.....“ ان کے تو فرشتوں کے علم میں بھی نہیں تھا وہ کیا کہنے جا رہے ہیں۔

”ہم آپ سے اپنے زریون کے لئے مسفرہ کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں“ یوسف صاحب کی بات پر کمرے میں موجود ہر شخص کو گویا سکتہ ہو گیا تھا۔

حمران کی نظریں بے اختیار مسفرہ کی طرف اٹھی تھیں اور اس کی اتنے دنوں کی خاموشی فقط اس ایک گھڑی میں حمران کی سمجھ میں آگئی تھی۔

”لیکن بھائی جان! آپ کو تو پتہ ہے مسفرہ شروع سے آفاق سے منسوب ہے۔“ سب سے پہلے قدسیہ کا سکتہ ٹوٹا تھا۔

”ہمیں علم ہے قدسیہ! ہم بے خبر نہیں، لیکن ہم سب اب مسفرہ سے اس قدر رنج ہو چکے ہیں کہ مسفرہ ہمیں اب گھر کے فرد کی طرح عزیز ہو گئی ہے۔“ یوسف صاحب نہایت رسائیت سے بولے۔

”مسفرہ ہمیں بھی اپنے گھر کے فرد کی طرح ہی عزیز ہے بھائی صاحب!“ شاہین چچی نے چبا کے لفظ ادا کیئے۔

”اس کی وجہ کیا ہے؟“ زرینہ بیگم نے دوبارہ مداخلت کی۔

”وہ ہمیں سچی نہیں بنی محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں اس میں بھی ایسی برائی نظر نہیں آئی جس کی وجہ سے ہم اسے مسترد کریں۔“ عالم پچا متانت سے بولے۔

”اور اگر ایسی ہی خوبیوں والی آپ کو ایک اور لڑکی مل جائے تو.....“

”بھئی سیدھی سی بات ہے ہمیں چاہیے ہی نہیں اور نہ ہی ہم میں ڈھونڈنے کی سکت ہے۔“ شاہین کی عادت تھی وہ ہمیشہ دو ٹوک انداز میں بات کیا کرتی تھیں۔

”آپ یقین کریں عالم بھائی اور شاہین بہن! ہمیں آفاق بالکل اپنے زریون کی طرح عزیز ہے ہمیں تو اس خاندان کا ہر بچہ ہی عزیز ہے۔ ہمیں اگر آپس میں کوئی ضد و عناد ہوتا یا ہم ایک دوسرے کی اولادوں میں تفریق کرتے تو بھلا اتنے سال تک اکٹھے رہ سکتے۔ آگے سے ہمارے بچے بھی بڑے اچھے ہیں، بالکل بہن بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔“ باتیں ان کی واقعی ٹھیک تھیں وہ دونوں ہی قائل ہو گئے۔

”اور صوما اور ماہا بھی مسفرہ کی طرح ہیں۔“ انہوں نے بات جاری رکھی۔

”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں بہن جی!“ عالم چچانے الجھ کر پوچھا۔

”ہماری اس تمہید کا مطلب ہے کہ آپ مسفرہ ہمیں دے دیں۔ صوما اور ماہا کا بھی آپ مسفرہ سے کم نہیں پائیں گی۔ یہ کوئی سودے بازی نہیں ہے نفوذ بالذات بالکل آپس کے تعلقات کو مزید استوار کرنے اور بہتر بنانے کی ایک کوشش ہے اور ہماری اور ہمارے بچوں کی خوشی ہے۔“ یہ دوسرا ہم تھا جو ان سب کے سروں پہ پھٹا تھا۔

”ناٹ بڈ آئیڈیا۔“ سب سے پہلے حمران نے زبان کھولی تھی۔ قدسیہ بیگم بھی چونک گئی تھیں۔ مسفرہ کا بیزار سا انداز انہیں بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ لیکن تب وہ انجان تھیں اور اسے ماحول کی تبدیلی پر محمول کر رہی تھیں۔

”میرا خیال ہے صوما، ماہا کی نسبت زیادہ ٹھیک رہے گی۔“ آفاق بڑبڑایا۔ لیکن اس کی

بڑبڑاہٹ اتنی واضح تھی کہ عالم پچا کے کانوں تک بخوبی پہنچ گئی۔

”مسفرہ! تمہاری کیا رائے ہے؟“ حمران کے سوال پہ سب کی نظریں اس پہ ٹپک گئیں۔

”میری رائے وہی ہوگی جو آپ سب فیصلہ کریں گے۔“ اس کے جواب پہ حمران نے فخریہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ محمود اور قدسیہ کی آنکھوں میں بھی مان تھا۔

”ہمارے بچے ہمارا فخر ہیں۔ ہمیں بھی ان کا مان رکھنا چاہیے۔“ زرینہ بیگم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ قدسیہ اب محمود کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ آخر ان کے بھائی نے یہی دفعہ ان سے کچھ مانگا تھا۔ جب کہ محمود اپنے بھائی عالم کو دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی اپنے بھائی کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ عالم نے اپنے بیٹے آفاق کی طرف دیکھا۔

”فیصلہ کر دیجئے ابو جان! میں ہرگز انحراف نہیں کروں گا۔“ ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ عالم نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کے آہستگی سے تھپتھپایا۔

”ٹھیک ہے یوسف بھائی! ہمیں بھی زریون، آفاق سے کم نہیں۔ اگر آپ اپنے جگر کا ٹکڑا ہمیں دے سکتے ہیں تو ہمیں بھی اتنا پتھر دل نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے بچوں کی خوشیاں ہمیں بھی عزیز ہیں۔“ پہلے تو ان سب کو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا اور جب یقین آیا تو سب خوشی سے اچھل پڑے۔

بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے یہاں بھی وہ سب کچھ ہو گیا تھا جس کا انہوں نے بھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ان سب کے دل بے اختیار ہی بارگاہ الہی میں سجدہ ریز ہو گئے۔

-----

”ایک بات غور سے سن لو، میں ہر روز برتن

نہیں دھو سکتا۔“ پوری ہنگ جزیشن اس وقت لاؤنج میں دھرتا مارے بیٹھی تھی۔ وہ عید صبح کو پھینکی اور بے رونق محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دم ہی گل و گلزار بن گئی تھی۔ سب سے آنکھ بچا کے آفاق صوما سے مخاطب ہوا تھا۔ جو اس سے کچھ فاصلے پر ہی فلوریشن پہ بیٹھی تھی۔

”یہ تم کیا اس کے کان میں کہہ رہے ہو۔“ عون کی عقلمانی نگاہوں نے فوراً اسے تار لیا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ فوراً مکر گیا۔ صوما کے لبوں پہ بڑی شریلی سی مسکان تھی۔ جسے دیکھتے ہوئے آفاق سوچ رہا تھا۔

”اگر عون اسے بروقت مطلع نہ کر دیتا تو شاید وہ بھی اتنا اچانک فیصلہ نہ کر پاتا اور اسے مسفرہ سے اتنے سالوں سے اس لئے محبت نہیں ہوتی کہ وہ اس کے نصیب میں تھی ہی نہیں اور جو اس کے نصیب میں تھی وہ چند لمحوں میں ہی کتنی عزیز ہو گئی تھی یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی۔“

شام کو وہ سب تفریح کی غرض سے کوئی پروگرام بنا رہے تھے۔ جب لاؤنج کا دروازہ کھول کے زریون اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر مسفرہ اتنی حیران ہوئی کہ ہونفوں کی طرح منہ اٹھا کے اسے ہی دیکھ گئے۔

وہ آئے ہیں ہم سے عید ملنے کے واسطے یا رب ہماری عید ہونی بھی تو شام کو عون کے حسب حال شعر پڑھنے پہ جہاں وہ بری طرح گڑبڑاتی تھی۔ وہیں سب کے بلند و بانگ قہقہے آزاد ہوئے تھے۔ وہ آتو سب کے ساتھ ہی گیا تھا۔ لیکن ایک قریبی ہول میں ٹھہر گیا تھا۔ عون نے کہا تھا اگر حالات سازگار ہوئے تو وہ اسے اطلاع دے دے گا۔

”عید مبارک۔“ نظریں اگرچہ اسی پہ تھیں لیکن کہاں سب کو گیا تھا۔

”تھیں بھی۔“ حمران اور آفاق اس کے



کچلے مل رہے تھے۔ عون کو بھی قہقہہ کرنی پڑی۔  
 ”بھائی! میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی  
 جو اب زریون نے ایک دھوکا اس کی کمر پہ جڑ دیا  
 تھا۔“  
 ”افوہ..... یار! لگتا ہے تمہارے ہاتھ بھی  
 کسی پاورفل سینٹ سے بے ہیں۔“ عون کراہتا  
 ہوا اس سے الگ ہوا تھا۔  
 ”ابھی بھی وقت ہے مسفرہ! سوچ لو۔“ وہ  
 مسفرہ کی طرف گھوما جو اسے گھور کے رہ گئی۔  
 ”میرا خیال ہے ہم کہیں جا رہے تھے۔“ ماہا  
 نے یاد دہانی کرائی۔  
 ”کسی قریبی ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں ہمیں  
 تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ یہ حمران تھا۔  
 ”توبہ، حمران بھائی! پورا بکرہ کھا کے بھی  
 آپ کا یہ چال ہے۔“ مسفرہ چلائی تو انھی۔  
 ”یہ تمہارے ہاتھ پہ کیا لگا ہے مسفرہ!“  
 زریون نے قریب آکر کہا۔  
 ”کیا لگا ہے۔“ مسفرہ نے اپنا ہاتھ آگے  
 بڑھا کے خود ہی اسے دیکھا۔  
 ”یہ دیکھو۔“ اس نے فوراً ہی اس کی کلائی  
 پکڑ لی۔  
 ”کیا؟“ وہ چلاتی ہی رہ گئی۔  
 ”میں محمود انکل سے اجازت لے آیا  
 ہوں۔ ہم لائٹ ڈرائیو پہ جا رہے ہیں آپ لوگوں  
 کو جہاں جانا ہو جائیں۔“ وہ تقریباً اسے ٹھینچتا ہوا  
 باہر لے گیا تھا۔  
 ”یہ اولاد شریف ہے۔“ عون دونوں  
 ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔  
 ”یہ کیا بد تمیزی تھی زریون بھائی!“ اس کے  
 روڈ پہ گاڑی لاتے ہی وہ بول اٹھی۔  
 ”پکلی بات تو یہ کہ تم مجھے اب ”بھائی“  
 نہیں کہا کرو گی اوکے سخت چڑ ہے مجھے اس بھائی

کے دم چلے سے۔“ وہ تمللا کے بولا تھا۔ مسفرہ کو  
 ہنسی آگئی۔  
 ”آپ نے عیدی نہیں دی مجھے۔“ وہ ایک  
 دم یاد آنے پہ بولی۔  
 ”تم کون سا عید ملی ہو مجھے۔“ وہ معنی خیز  
 انداز میں منکرایا۔ مسفرہ سرخ پڑ گئی۔  
 ”زریون بھائی!“ احتجاجی انداز میں چیختے  
 وہ ایک دم زبان دانٹوں تلے دب گئی۔  
 ”ویسے زریون بھائی..... میرا نام نہیں ہے  
 زریون یوسف ہے۔“ وہ بولا۔  
 ”بڑا پسند ہے ناں آپ کو اپنا نام۔“ وہ چڑ  
 کے گویا ہوئی۔  
 ”بہت احمق دیکھ لینا میں تو اپنے بچوں سے  
 بھی کہوں گا کہ میرا نام ہی لیا کریں۔“ اس کے  
 چہرے کے تاثرات سے محفوظ ہوتے ہوئے اس  
 نے کہا۔  
 ”اگر آپ نے ایسا ہی کرتی ہیں تو مجھے  
 نہیں اتار دیں۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔  
 زریون نے فوراً گاڑی روک دی۔ مسفرہ  
 دھک سے رہ گئی۔  
 ”کیا وہ دہائی سے اتارنے لگا تھا؟“  
 گاڑی روک کے اس نے ڈیش بورڈ سے  
 نیچے ایک مٹلی ڈبیا اٹھائی پھر بڑی سہولت سے اس  
 کا ہاتھ تمام کراس میں اٹھوٹی پہنادی۔  
 اسے تشبیہ کا دوں آسرا کیا  
 وہ خود چاند ہے تو پھر چاند سا کیا  
 مسفرہ کو لگ رہا تھا وہ بیس پانی بن کر پھسل  
 جائے گی۔ جتنی ان نگاہوں کی حدت تھی۔  
 ”عیدی۔“ تو میں نے تمہیں دے دی ہے  
 لیکن ابھی میری ”عید“ تم پہ ادھا رہے۔“ وہ کہہ  
 رہا تھا جب کہ مسفرہ کا چہرہ حیا سے مزید جھک  
 گیا۔